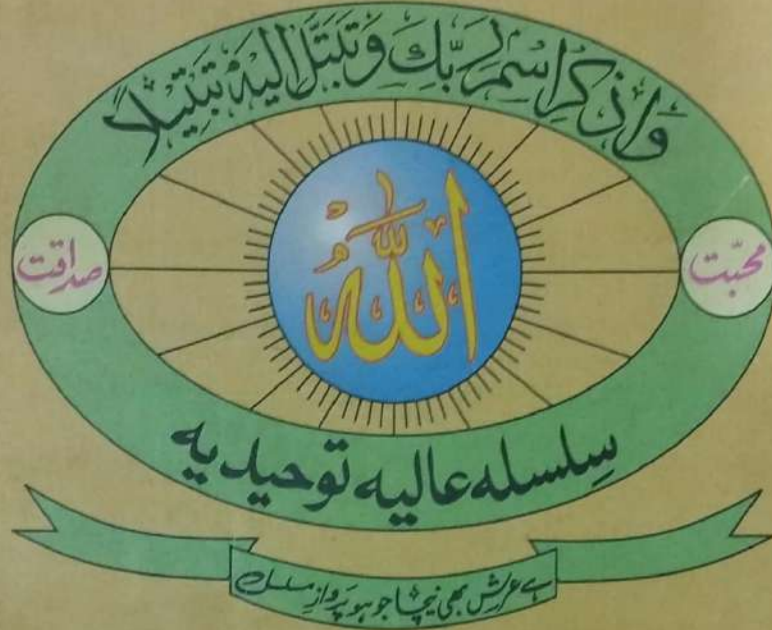
جلد 5 شمارہ 6 اگست 2003ء جمادی الثانی 1424ھ

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰیۙ وَ ذَکَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰیؕ (الاعلیٰ 14-15)

بے شک وہ مراد کو پہنچ گیا جو پاک ہوا۔ اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا۔



عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح وفلاح کا علمبردار

ماہنامہ

فلاحِ آدمیت

گوجرانوالہ

Registerd

CPL No. 491

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

اغراض و مقاصد

- کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کے مطابق خالص توحید، اتباع رسول ﷺ، کثرت ذکر، مکارم اخلاق اور خدمت خلق پر مشتمل حقیقی اسلامی تصوف کی تعلیم کو فروغ دینا۔
- کشف و کرامات کی بجائے اللہ تعالی کے قرب و عرفان اور اسکی رضا و لقاء کے حصول کو مقصود حیات بنانے کا ذوق بیدار کرنا۔
- حضور ﷺ کے صحابہ کی پیروی میں تمام فرائض منصبی اور حقوق العباد ادا کرتے ہوئے روحانی کمالات حاصل کرنے کے طریقہ کی ترویج۔

موجودہ زمانے کی مشغول زندگی کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نہایت ہی مختصر اور سہل العمل اوراد و اذکار کی تلقین۔

- غصہ و نفرت، حسد و بغض، تجسس و غیبت اور ہوا و ہوس جیسی برائیوں کو ترک کر کے قطع ماسواء اللہ، تسلیم و رضا، عالمگیر محبت اور صداقت اختیار کرنے کو ریاضت اور مجاہدے کی بنیاد بنانا۔
- فرقہ واریت، مسلکی اختلافات اور لاحاصل بحثوں سے نجات دلانا، تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کی اہمیت کا احساس پیدا کر کے اپنی ذات، اہل و عیال اور احباب کی اصلاح کی فکر بیدار کرنا۔
- اللہ تعالی کی رضا، اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی اور ملت اسلامیہ کی بہتری کی نیت سے دعوت الی اللہ اور اصلاح و خدمت کے کام کو آگے بڑھانا۔ اپنے مسلمان بھائیوں کے دلوں میں قلبی فیض کے ذریعے اللہ تعالی کی محبت بیدار کرنا اور روحانی توجہ سے اسکے اخلاق کی اصلاح کرنا۔

عالمگیر محبت، اکرام انسانیت اور فلاح آدمیت کا علمبردار

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

بیادگار خواجہ عبدالحکیم انصاری رحمۃ اللہ علیہ
بانی سلسلہ

نگران و سرپرست
محمد صدیق ڈار صاحب توحیدی
شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ



جلد 5 شمارہ 6 اگست 2003ء جمادی الثانی 1424ھ

ایڈیٹر وحید احمد

مجلس ادارت

محمد مرتضٰی توحیدی، ایم محمد اکرم، پروفیسر منیر احمد لودھی، ایم محمد طالب
ڈاکٹر عبدالرشید وقار، محمد صدیق، سید عاشق حسنین مرتضٰی شاہ بخاری
مولانا حافظ بشیر احمد

قیمت ——— -/15 روپے
سالانہ فنڈ ——— -/150 روپے

شیخ سلسلہ سے رابطہ کیلئے:
محمد صدیق ڈار توحیدی
مرکز تعمیر ملت نزد توحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ
Ph:0431-893535
Mob: 0320-5793520

ایڈیٹر سے رابطہ کے لئے:
وحید احمد
تھانہ روڈ بلدیہ مارکیٹ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ
Ph:0431-293379

پبلشر عامر رشید انصاری نے معراج دین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

Fax: No. +92-431-222020
E-mail: tohidia@hotmail.com

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

اس شمارے میں

اداریہ

اسلام انسان کو ایسی زندگی کی تعلیم دیتا ہے۔ جس کا مقصد بھلائی کا فروغ اور برائی کی روک تھام ہے۔ حیات بعد الموت کے تصور سے انسان پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ اس زندگی میں جو کچھ بھی کرے گا اسے اس کا حساب دینا پڑے گا اور افعال بد کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ آخرت کی باز پرس اور ابدی مستقبل کی تباہی کا خطرہ انسان میں خوف خدا پیدا کر دیتا ہے۔ اور وہ ہر ایسے فعل سے دور بھاگتا ہے جس سے برائی جنم لیتی ہو۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے

کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکرو تومنون باللہ (آل عمران)

"لوگوں کی رہنمائی کے لئے جس قدر امتیں پیدا ہوئیں۔ ان میں تم (مسلمان) سب سے بہتر ہو کہ اچھے کام کرنے کو کہتے ہو، برے (کاموں) سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو" آنحضرتؐ نے فرمایا" میں حسن اخلاق کی تمکیل کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ بے شک میں محاسن اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں" قرآن و حدیث کے ان الفاظ سے واضح ہے کہ اسلام اچھائی کے فروغ اور برائی سے پرہیز کا حکم دیتا ہے۔ اور اس پر عمل کرنے والی قوم اللہ کے نزدیک بہترین قوم ہے۔ آنحضرتؐ کا عمل سراسر اصلاح اخلاق ہے۔ چنانچہ اسلامی نظام اخلاق میں جو چیزیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ وہ درج ذیل ہیں۔

ان میں اول صبر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان بڑی سے بڑی مشکل و مصیبت میں بھی ثابت قدم رہتا ہے۔ اپنے اللہ پر بھروسہ کرتا ہے۔ اور مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔ خود قرآن کہتا ہے " تجھے جو تکلیف پہنچے، اس پر صبر کرو بے شک یہ بڑے حوصلے کی بات ہے" اور اللہ سے صبر و نماز کے ذریعہ مدد مانگو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے" اس طرح انسان میں بلند حوصلہ، مضبوطی کردار، استقلال اور اپنے اللہ پر بھروسہ کرنے جیسی صلاحیتیں اجاگر ہوتی ہیں۔ اور انسان مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے معمولات میں مگن رہتا ہے۔

دوم: تقویٰ ہے اس کا مطلب ہے، رضائے الٰہی کو ہر چیز پر مقدم جاننا۔ یہ ایسا پختہ جذبہ ہے جس کی بنا پر انسان برائی سے بچتا ہے، اور نیکی کی راہ اختیار کرتا ہے۔ دل میں خوف خدا ہو تو انسان کا ہر عضو حق کے لئے وقف ہوتا ہے۔ تقویٰ سے عام مراد اگرچہ خوف خدا ہے، لیکن عملی صورت میں احکامات خداوندی کی مکمل پیروی سے انسان متقی بنتا ہے۔ چنانچہ یہ خوبی اسلامی نظام اخلاق کی ایک مضبوط اینٹ کی حیثیت رکھتی ہے۔

سوم: اخوت ہے اس کا مطلب اللہ پر ایمان لانے والوں کے درمیان باہمی جذبہ محبت کا فروغ ہے اصحاب ایمان کا آپس میں وہی رشتہ ہے جو ایک جسم کے تمام اعضاء کا ایک دوسرے سے ہے۔ مسلمان ایک دوسرے کے دکھ درد میں اس طرح شریک ہوں جیسے کہ وہ دکھ ان کا اپنا ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ کی حدیث ہے کہ جب تک مسلمانوں میں اخوت نہ ہو وہ صاحب ایمان ہی نہیں ہو سکتے۔ اخوت کی جو وضاحت اسلام نے کی ہے، اس کی رو سے تمام مسلمان، زبان، رنگ، نسل، قوم، علاقہ اور طبقہ کے امتیازات سے بالاتر ہو کر آپس میں بھائی بھائی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اور وہ ایک دوسرے کے انتہائی قریب آ جاتے ہیں۔ یہ اخوت مسلمانوں میں ایک طرح کے مساوات کو جنم دیتی ہی۔

چہارم: اتحاد ہے توحید پر ایمان لانے سے مسلمانوں میں جو جذبہ اخوت پیدا ہوتا ہے، اور تمام لوگ آپس میں بھائی بھائی بن جاتے ہیں تو اس سے اہل ایمان کے درمیان زبردست اتحاد قائم ہوتا ہے۔ جو ہر طرح کے مفادات و وقتی ضرورت سے بالاتر ہو کر زندگی بھر کے لئے قائم رہتا ہے۔ اس اتحاد سے مسلمانوں میں زبردست طاقت پیدا ہو جاتی ہی۔ جو حق کو پھیلانے اور برائی کو مٹانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

پنجم: مساوات ہے اہل ایمان آپس میں بھائی بھائی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ان میں کوئی امتیاز، جیسے نسل، رنگ، زبان، قوم اور علاقہ باقی نہیں رہتی۔ اسی لئے معاشرہ میں انسان کو جو حقوق حاصل ہوتے ہیں وہ سب کے لئے مساوی ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسی لئے علامہ اقبال آنحضرتؐ کی بعثت کی غرض، حریت، مساوات اور اخوت بنی نوع انسان قرار دیتے ہیں۔

ششم: عدل ہے اسلام مسلمانوں کو عدل کا حکم دیتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ اور ہر ایک کے حقوق کی ضمانت اس طرح دی جائے کہ کوئی ناانصافی نہ ہو سکے، قرآن کہتا ہے "ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے تا کہ جو کچھ تجھے خدا سمجھائے اس سے تم لوگوں کے درمیان انصاف کرو، اور تم خیانتوں کے حامی نہ ہو" یہ خوبی انسانی معاشرہ میں مستقل توازن قائم کر دیتی ہے۔

ہفتم: احسان ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ معاشرہ میں اگر کسی سے غلطی سرزد ہو جائے تو اسے معاف کر دیا جائے۔ یہ وہ صفت ہے جو خود اللہ تعالیٰ میں ہے۔ چنانچہ قرآن کی زبان میں "اور تو بھی احسان کر جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان کیا، اور "پس تو ان کو معاف کر، اور درگذر کر اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے" اور "چاہیے کہ مومن معافی اور درگذر سے کام لیں، کیا تم

نہیں چاہتے کہ خدا تمہیں معاف کرے۔ اللہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے" چنانچہ اس طرح اسلام معاشرہ میں ایک ایسی اخلاقی تبدیلی لاتا ہے۔ جہاں ظلم کا بدلہ انتقام نہ ہو کہ اس سے اجتماعی زندگی کا سکون تباہ ہو جاتا ہے اور انتقام در انتقام کی رسم چل نکلتی ہے۔

ہشتم: رواداری ہے اسلامی نظام اخلاق میں رواداری کو بھی خصوصیت حاصل ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مسلمان غیر مسلموں یہاں تک کہ مخالفین اسلام کے ساتھ بھی حسن سلوک سے پیش آئیں۔ ان سے کسی قسم کی زیادتی نہ کی جائے، اور نہ ہی ان کی عزت نفس کو مجروح کیا جائے۔ چنانچہ اسی رواداری کا نتیجہ ہے کہ اسلام غیر مسلموں کے معبودوں کو برا کہنے سے منع کرتا ہے۔ اس خوبی کے باعث معاشرہ میں مسلمانوں کے حسن سلوک سے غیر مسلم متاثر ہوتے ہیں اور خود مسلمان معاشرہ میں اس کے مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

نہم: علم ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان جاہلیت سے چھٹکارا حاصل کریں۔ اور علم حاصل کریں۔ چنانچہ اسلام علم حاصل کرنے اور اس کی فضیلت پر اتنا زور دیتا ہے کہ اسے بنائے شرف قرار دیا جاتا ہے۔

دہم: خدمت خلق ہے اسلامی نظام اخلاق کی یہ بنیاد بھی انتہائی مضبوط ہے کہ مسلمان مخلوق خدا کی بے لوث، بغیر لالچ اور بلا معاوضہ خدمت کریں۔ اور دنیا جانتی ہے کہ خدمت خلق کا جذبہ کسی قوم کی کامیابی و کامرانی کا ضامن ہوتا ہے۔ خدمت خلق کے بعد اسلام اخلاص پر زور دیتا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ کوئی بھی کام، عبادت، یا عمل خلوص دل کے ساتھ کیا جائے اور صرف دکھاوے کے لئے نہ ہو۔ اس سے خود غرضی جنم لیتی ہے۔ پھر انسان اپنی کوششوں کے نتائج کو اللہ پر چھوڑ کر توکل کرے کہ جو چیز اس کے کرنے کی تھی وہ اس نے کر دی اور کامیابی و ناکامی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اسلام صدق سچائی و راست بازی پر زور دیتا ہے۔ اور ہر عمل میں امین بننے کی ہدایت کرتا ہے۔ امانت خواہ کوئی شے ہو یا انسانوں کے حقوق و راز ہر حالت میں دیانت داری لازمی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسلام اہل ایمان کو ظلم سے دور رہنے کی ہدایت کرتا ہے۔ جھوٹ و دروغ گوئی سے سخت منع کرتا ہے، غیبت و حرص کی سخت مخالفت کرتا ہے اور معاشرہ کی بنیاد اعلیٰ اخلاق پر قائم کرتا ہے۔

والسلام

وحید احمد

اقتدار اعلیٰ کا اسلامی تصور

(عبدالرشید)

اسلامی نظریہ حیات کی رو سے حیات و کائنات کی حقیقت وحیثیت کا تعین ہی خالق کل کے تصور سے ہوتا ہے۔ چنانچہ جب قرآن اعلان کرتا ہے کہ :

ذالکم اللہ ربکم له الملك الاله الخلق والامر فالحکم لله العلی الکبیر ولا یشرك فی حکمه احداً

"وہ ہے اللہ تمہارا رب، ملک اسی کا ہے، خلق اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا ہے، لہٰذا حکم اللہ بزرگ و برتر کے لئے خاص ہے، اور وہ اپنے حکم میں کسی کو حصہ دار نہیں بناتا"

اتبعو اما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعو امن دونه اولیاء

"جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے اس کی پیروی کرو۔ اور اس کے سوا دوسرے اولیاء (اپنے ٹھہرائے ہوئے کارسازوں) کی پیروی نہ کرو"

تو اس کا واضح مطلب یہ ہوتا ہے کہ کائنات وحیات انسانی کے اصل خالق اللہ کو اس کائنات میں مکمل اور بلا شرکت غیرے اقتدار اعلیٰ حاصل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین پر انسان کی حیثیت اللہ کی مخلوق کی ہے، اور اس کا کام مقتدر اعلیٰ اللہ کے احکامات کی روشنی میں زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ خود نہ تو کسی قسم کا اقتدار اعلیٰ رکھتا ہے۔ اور نہ ہی اسے ایسا کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی " قرآن انسانی عقل وفہم کی بنا پر قائم کردہ ان تمام افکار، نظریات اور دلائل کو باطل قرار دیتا ہے۔ جن کی رو سے ریاست کے نام پر انسان کو مقتدر اعلیٰ کے عہدہ پر فائز کر دیا جاتا ہے۔ قرآن کا استدلال یہ ہے۔ کہ انسان کسی طرح بھی اس منصب کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ مقتدر اعلیٰ وہی ذات حقیقی ہے جو نہ صرف خالق کائنات ہے بلکہ کائنات کی الوہیت بھی اسی کے لئے مسلم ہے۔ وہی ذات عقائد و اعمال، تدبیر و سیاست اور دستور و قانون کا سرچشمہ ہے۔ قرآن اقتدار اعلیٰ کے لئے ایک نہایت جامع اصطلاح "ملکوت" استعمال کرتا ہے۔ جس کے ذریعہ واضح ہوجاتا ہے۔ کہ اس کائنات کی ہر ہر شے اللہ ہی کے زیر اقتدار ہے۔ قرآن پوچھتا:

من بیدہ ملکوت کل شیء

"یعنی وہ ذات ہے جس کے ہاتھ میں اقتدار تمام چیزوں پر ہے"

اور یہ واضح کرتا ہے۔

فسبحٰن الذی بیدہ ملکوت کل شیء

"وہ ذات پاک ہے جس کے ہاتھ میں اقتدار تمام چیزوں پر ہے" یعنی قرآن واضح کرتا ہے کہ ذات پاک اللہ کا اقتدار اعلیٰ صرف زمین پر ہی نہیں آسمانوں، زمین اور پوری کائنات پر قائم ہے۔ اسے محکم فرمایا۔

كذلك نري ابراهيم ملكوت السموات والارض

"ہم نے اسی طرح ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمین کے اقتدار اعلیٰ کے عجائب کا مشاہدہ دکھایا" چنانچہ قرآن کی زبان میں اس مختار کل ذات کو کبھی رب العالمین اور رب العرش العظیم کہا گیا کبھی الملک القدوس، الملک الحق، ملک الناس

کے نام سے واضح کیا گیا اور کبھی احکم الحاکمین اور خیر الحاکمین کہا گیا۔ چنانچہ یہی ذات پاک ہر طرح کے ابہام سے پاک کائنات کی حقیقی مالک ہے اقتدار اعلیٰ کی وحدت کے ساتھ قرآن ریاست کے لئے الملک کی اصطلاح استعمال کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ یہ ریاست مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک پھیلنے کے علاوہ آسمانوں اور زمین کے درمیان جو کچھ بھی ہے اس کی وسعت میں شامل ہے قرآن کی زبان میں "برکت والا ہے وہ جس کے لئے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کی بادشاہت ہے" پھر قرآن یہ بھی واضح کرتا ہے کہ خالق کائنات اللہ کی بادشاہت یا اقتدار اعلیٰ وقتی یا عارضی نہیں ہے بلکہ ہمیشہ سے ہے اور قیامت تک قائم رہے گا چنانچہ فرمایا:

"دنیا اور آخرت اللہ ہی کے لئے ہے"

اللہ کے اس اقتدار اعلیٰ کے تحت ہر طرح کے احکامات و اختیارات اسی کے لئے مخصوص ہو جاتی ہیں چنانچہ جب قرآن الحکم کے لفظ کا استعمال کرتا ہے تو اس سے مراد حکومت ہوتی ہے لیکن حکومت کے سلسلے میں اللہ کے اقتدار اعلیٰ کی وضاحت میں قرآن کا استدلال یہ ہے کہ حکومت

کامکمل اور دائمی اختیار صرف ذات پاک اللہ کو ہے اور اس کے علاوہ کوئی قوت کائنات کی کسی چیز یا انسانوں پر حکومت کا دعویٰ نہیں کرسکتی چنانچہ فرمایا:

"حکومت کسی کا حق نہیں ہے سوائے اللہ تعالیٰ کے"

اور پھر یہ کہ اللہ کی حکومت میں کسی کو کوئی دخل نہیں وہ خود بلا شرکت غیرے حاکم اعلیٰ ہے۔

"حق (یعنی اللہ) کی حکومت میں کوئی شریک نہیں ہے"

اقتدار اعلیٰ کے اسلامی تصور کی خصوصیات

قرآن مجید کائنات کے مقتدر اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے اختیار کی بعض خصوصیات کا ذکر بھی کرتا ہے جن سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ کا اقتدار اعلیٰ عام سیاسی تصور اقتدار اعلیٰ سے ممتاز اور منفرد ہے۔ جیسے

وحدت اقتدار

قرآن کی رو سے اللہ کے اقتدار اعلیٰ کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ ذات باری تعالیٰ ہر حیثیت سے منفرد و یکتا ہے۔ ذاتی کے علاوہ صفاتی لحاظ سے بھی اس کا کوئی ثانی نہیں۔ قرآن کی زبان میں "اس کی مانند کوئی چیز نہیں" وہ واحد ہے جس کے لئے کل کائنات کی حکومت واقتدار مخصوص ہے۔

"حکومت صرف اللہ کے لئے ہے" اور "کوئی بھی حکومت میں اس کا شریک نہیں"

قرآن میں اللہ تعالیٰ کے سلسلہ اختیار کل میں وحدت اقتدار و توحید کا بار بار ذکر آتا ہے۔ اور اس کے لئے نئی نئی دلیلیں پیش کی جاتی ہیں ایک جگہ فرمایا:

"اس (یعنی اللہ) کے ساتھ کوئی اور معبود نہیں اگر ایسا ہوتا تو ہر معبود اپنی پیدا کی ہوئی مخلوق کو الگ لے بیٹھتا اور ضرور ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتا" دوسری جگہ فرمایا "اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین و آسمان دونوں تباہ و برباد ہو گئے ہوتے" اس لئے قرآن حکم دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہ بنایا جائے پھر قرآن واضح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات تمام دنیاوی رشتوں سے پاک ہے۔ "اللہ تعالیٰ نے نہ شادی کی اور نہ اس کی اولاد ہے"

چنانچہ قرآن اللہ تعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ کی اس خصوصیت کے پیش نظر واضح کرتا ہے کہ وہ واحد مقتدر اعلیٰ ہے اس کا کوئی شریک نہیں وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ کسی کے سامنے جواب

وہ نہیں۔ بلکہ کائنات کی ہر شے اس کے حکم کے تحت سرگرم عمل ہے۔

حیات ابدی

اسلامی تصور کے تحت اقتدار اعلیٰ کی دوسری خصوصیت اس کی حیات ابدی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات غیر فانی ہے۔ اس کی نہ تو ابتداء ہے اور نہ ہی انتہا۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ عام سیاسی تصور اقتدار اعلیٰ میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ وہ آئے دن بدلتا رہتا ہے۔ جس کی ابدیت تو درکنار دنیا کا ساتھ دینے کی سکت بھی نہیں ہوتی۔ عقل مطالبہ کرتی ہے کہ نظام عالم میں ہم آہنگی و یکسانیت برقرار رکھنے کے لئے ایسے اقتدار اعلیٰ کی ضرورت ہے جو از ابتداء تا انتہا ہمیشہ رہے۔ چنانچہ اسلامی تصور اقتدار اعلیٰ میں یہ خصوصیت موجود ہے۔ جب قرآن کہتا ہے۔ **لله الامر من قبل ومن بعد** تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ چونکہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اس لئے اس نظام عالم کی بقاء وفناء اسی سے وابستہ ہے۔ اس نظام میں تسلسل و ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اور اللہ کے قوانین بالکل اٹل ہیں۔ جن میں کسی قسم کی تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے۔

قدرت کاملہ

قرآن واضح کرتا ہے کہ اللہ کے اقتدار اعلیٰ کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کا اقتدار ہر جگہ اور ہر چیز پر قائم رہتا ہے۔ اس کی ریاست کی کوئی حد نہیں۔ زمین، آسمان، سورج، چاند، ستارے، جمادات، نباتات، حیوانات سب ہی پر اختیار کل اللہ کو حاصل ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

"بے شک اللہ تعالیٰ تمام چیزوں پر قدرت رکھنے والا ہے"

اور مخلوق پر اللہ کی حکمرانی کا ذکر کرتے ہوئے دعویٰ کرتا ہے "زمین پر چلنے والا کوئی ایسا نہیں جس کی چوٹی اللہ کے ہاتھ میں نہ ہو" قرآن کریم کے اقتدار اعلیٰ کو الوہیت کے ساتھ ساتھ الوہیت کے اختیارات بھی حاصل ہیں۔ خالق کائنات کی حیثیت سے وہ حکمران کے ساتھ تمام مخلوق کا روزی رساں بھی ہے زمین وآسمان اور ان کے درمیان پائی جانے والی ہر شے کو نیست سے ہست میں لانے والا وہی ہے۔ اس لئے فرمایا "خبردار ہو جاؤ کہ پیدا کرنا اور حکومت کرنا اسی کے لئے

مخصوص ہے"

پھر قرآن مجید واضح کرتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ کا یہ اقتدار صرف اس دنیا میں ہی نہیں حیات بعد الموت میں بھی قائم رہے گا۔ قرآن اللہ کے اقتدار کی اس خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے واضح ہے کہ اللہ اپنی مرضی سے حکومت کرتا ہے اور کسی قوت کو اس کی مرضی ومنشا کے سامنے چوں وچرا کرنے کی مجال نہیں۔ وہ "جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے" اور "اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کوئی اس کو پیچھے ڈالنے والا نہیں"

قرآن کریم اللہ کے اقتدار اعلیٰ کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے واضح کرتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ بزرگ وبرتر ہے۔ اور کوئی دوسری طاقت اس کے مدمقابل نہیں۔ چنانچہ فرمایا:

"وہ سب سے بلند وبزرگ ہے"

"سب قوت اللہ کے لئے ہے"

"بے شک تیرا رب قوت والا وغالب ہے۔"

چنانچہ قرآن کے مطابق اللہ تعالیٰ جس کو چاہے بڑا کردے۔ جس کو چاہے تکلیف میں مبتلا کردے۔ اس کے علاوہ کوئی طاقت انسان کو فائدہ یا نقصان پہنچانے پر قدرت نہیں رکھتی۔ وہ قادر مطلق ہے قرآن مجید اعلان کرتا ہے۔

"اگر اللہ تجھے کوئی تکلیف پہنچائے تو اس تکلیف کا سوائے اس کے کوئی دور کرنے والا نہیں اور اگر تجھے بھلائی پہنچانے کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو کوئی ہٹانے والا نہیں۔" پھر فرمایا:

"جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کے ساتھ برائی کا ارادہ کرتا ہے تو کوئی اس کا رفع کرنے والا نہیں ہے۔ اور اس کے سوا کوئی ان کا کارساز نہیں" اس طرح اسلامی تصور اقتدار اعلیٰ میں قوت اختیار قدرت اتنی ابدی وہمہ گیر ہے کہ اس کے علاوہ کسی شخص کی قوت کا مقتدر اعلیٰ ہونا باطل ہو جاتا ہے۔ کائنات کا مقتدر اعلیٰ اس کا خالق، رازق، حاکم اور ابتداء وانتہاء کا مالک کل ہی ہونا چاہیے اور اسی کو یہ حق بھی حاصل ہے۔

اسلامی اخوت

(رانا اعجاز احمد)

حضرت ابوحمزہ انس بن مالکؓ رسول اللہؐ کے خادم سے روایت ہے۔ کہ یقیناً رسول اللہؐ نے فرمایا تم میں سے کوئی (کامل) مومن نہیں ہوسکتا۔ یہاں تک کہ اپنے بھائی کے لئے وہی چاہے جو وہ اپنی جان کے لئے چاہتا ہے۔ (اسے بخاری اور مسلم نے روایت کیا)

اسلامی اخوت کا تقاضا

لایومن احدکم تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا۔ اس سے مراد ایمان کی بلندی اور کمال ہے۔ یعنی تم میں سے کوئی آدمی مومن کامل اس وقت تک نہیں ہوسکتا۔ جب تک اپنے بھائی کے لئے وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ کیونکہ ایمان کا ادنیٰ درجہ کلمہ طیبہ پڑھنے سے ہی حاصل ہوجاتا ہے۔ یہاں بھائی سے مراد دینی بھائی ہے یا پھر انسانی برادری کا کوئی فرد۔ اس میں کافر و مسلم سب شامل ہیں۔ یعنی سب لوگوں کے لئے وہی کچھ پسند کرنا چاہیے جو خود اپنی ذات کے لئے پسند ہو۔ مثلاً یہ کہ وہ مشرف با اسلام ہو جائے کافر کے حق میں یہ دعا مستحب ہے کہ خداوند کریم اسے اسلام لانے کی توفیق عطا کرے۔

اس حدیث میں رسول اکرمؐ نے ایمان کے درجات اور مراتب بیان کئے ہیں اور ساتھ ہی حقوق العباد کی طرف توجہ دلانا بھی مقصود ہے۔ خود غرضی اسلام میں ایک ناپسندیدہ اور مذموم خصلت ہے اس سے دامن بچا کر ہی ایمان میں ترقی اور سربلندی حاصل ہوسکتی ہے۔ دوسری طرف ایثار اور قربانی کو اسلام نے بہت پسند کیا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوا ہے۔

ویوثرون علیٰ انفسهم ولو کان بهم خصاصة (الحشر ۹)

وہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ خود تنگدستی میں مبتلا ہی کیوں نہ ہوں۔

دوسری آیت میں یوں ارشاد ہوا ہے۔ **انما المومنون اخوة** مومن سب آپس

میں بھائی ہیں۔اس حدیث نے اخوت کا تقاضا اس بات کو قرار دیا ہے کہ دوسرے انسان کو اپنے سے کمتر خیال نہ کرے بلکہ اسکو اپنی ذات کے برابر تسلیم کرتے ہوئے اس کی عزت افزائی کرے۔

رسول اکرمؐ نے اپنے متعدد دوسرے ارشادات میں اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ دوسرے انسانوں کے ساتھ ایک مومن کا رویہ کس طرح ہونا چاہیے۔چنانچہ ارشاد فرمایا ہے۔

آپس میں ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو۔ایک دوسرے پر حسد نہ کرو۔اور ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو۔اور خدا کے بندو بھائی بھائی بن کر رہو(بخاری)

ساری مخلوق اللہ کی عیال ہے اور اللہ سب سے زیادہ محبت اس بندے سے کرتا ہے جو اس کی مخلوق کے ساتھ سب سے زیادہ نیک سلوک کرنے والا ہو۔

رسول اللہؐ کے ارشاد سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دوسروں کو وہی درجہ دینا کافی نہیں جو انسان خود اپنی ذات کو دیتا ہو۔بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ لوگوں کی ضروریات اور حاجات کے لئے دوڑ دھوپ کرنا اور جہاں تک ممکن ہو اپنا وقت اور سرمایہ خرچ کر کے انسانوں کے لئے آسانیاں پیدا کرنا اور تکالیف سے نجات دلانا مزید پسندیدہ فعل ہے۔بلکہ اس سے اللہ تعالیٰ خوش ہو کر ایسا کرنے والے کی حاجت پوری فرماتا ہے۔

ارشاد فرماتا ہے۔

"ومن كان فى حاجة اخيه كان الله فى حاجته"

"اور جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں لگا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت پوری کرنے کا بندوبست کرتا ہے۔

ان آیات واحادیث سے مندرجہ بالا حدیث کا مطلب بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ مومن کا کمال ایمانی اس میں ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ بہترین سلوک کر کے اپنے درجات بلند کرے۔

خواجہؒ کے خطوط

(تدوین وترتیب:- خالد مسعود توحیدی)

1- نشہ بڑھ جانے پر حکم

(بنام طارق محمود 1974-2-10)

"اپنے والد صاحب سے کہیں کہ آپ کو قبلہ انصاری صاحب نے حکم دیا ہے کہ نماز باقاعدہ پڑھیں۔ ذکر بالکل بند کردیں اور ہر وقت یہ درود شریف پڑھا کریں۔ "صلی اللہ علیک یا رسول اللہ" انشاءاللہ ہفتہ عشرہ میں طبیعت درست ہو جائے گی۔"

2- شادی اور پریشانی

(بنام محمد صدیق ڈار 1967-7-20)

"گلزار صاحب ملے تو تھے۔ یہ لوگ خواہ مخواہ شادی کے مسئلہ میں الجھ کر پریشان ہوتے ہیں۔ میری رائے میں تو اس زمانہ میں شادی نہ ہی کرائی جائے تو اچھا ہے۔"

3- تبلیغ سے پہلے

(بنام محمد صدیق ڈار 1959-12-4)

"اور تبلیغ کا کام تبھی ہو سکتا ہے جبکہ پیٹ کی طرف سے بے فکری ہو۔ اگر آپ کو اس طرف سے فراغت ہے تو پھر ان علوم کا مطالعہ شروع کریں۔ اگر نہیں ہے تو پہلے دنیا کو ٹھیک کرنے کی کوشش کریں اور لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ خدا ان کا ذمہ دار ہے۔ صرف روحانیت اور دنیا پہلے درست کریں پھر آگے سوچیں گے۔"

4- اللہ کی رضا

(بنام محمد مرتضیٰ 1964-4-28)

"آپ میں کوئی خاص اخلاقی کمزوری نہیں ہے اور جو آپ کو محسوس ہوتی ہے ان میں سے ایک ایک کر کے کوشش سے دفعہ ہو سکتی ہے۔ اس بارے میں زیادہ پریشان کی ضرورت نہیں۔ آپ اللہ کو زیادہ سے زیادہ دل سے یاد کرنے کی کوشش کریں اور دنیاوی ہر قسم کے تفکرات کا دل اور دماغ پر اثر نہ ہونے دیں۔ کوشش سے یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ اللہ کی رضا حاصل ہو جائے گی۔"

5- دنیا کی دولت

(ا) "دنیا بھی ضروری ہے۔ اس میں برابر کوشش جاری رکھنی چاہیے۔"

(بنام اکبر مغل 1971-11-30)

(ب)" حلقہ کے لئے دنیوی دولت حاصل کرنے کا طریقہ (توحید یہ سوسائٹی) تو اختیار کرلیا ہے۔ اب آئندہ اللہ کی مرضی۔"

(بنام محمد صدیق ڈار 16-3-1962)

(ج)" سوسائٹی کے روپوں سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ سب کام محمد قاسم صاحب کرتے ہیں۔ آپ ان کو لکھیں وہ بھیج دیں گے۔۔ آپ لکھ دیں کہ روپیہ آپ کو بھیجا جائے یا سید علی صاحب کو۔"

(بنام محمد مرتضٰی صاحب 4-6-1966)

6- کمزوری نہیں اتفاق ہے

(بنام محمد مرتضٰی 4-6-1966)

" یہ تو درست ہے کہ آپ نے بہت عرصہ سے کسی نئے اچھے آدمی کو حلقہ میں داخل نہیں کیا۔ لیکن یہ کمزوری کی وجہ سے نہیں اتفاق کی بات ہے۔"

7- سعادت نفس

(بنام محمد صدیق ڈار 4-12-1959)

" آپ نے جو یہ تحریر کیا ہے کہ آپ کو یہ خیال اکثر ستاتا رہتا ہے کہ اسلام اور اللہ کا راستہ کتنا سادہ ہے لیکن یہ لوگ راہ راست پر کیوں نہیں آتے۔ یہ خیال آپ کی سعادت نفس پر دلالت کرتا ہے۔"

8- اہل اللہ بننے کے لئے

(بنام محمد صدیق ڈار 4-12-1959)

" تنہائی پسند اور کم گو ہونا اہل اللہ بننے کے لئے بہت ضروری ہے۔ اس لئے آپ کی یہ عادت مبارک ہے۔"

9- کبھی ٹھنڈ کبھی گرمی

(بنام محمد صدیق ڈار 26-5-1962)

" معاملہ کی ٹھنڈ کی بات یہ ہے کہ یہ قدرتی اصول ہے۔ کبھی ٹھنڈ کبھی گرمی۔ اس لئے اس سے زیادہ پریشان نہ ہونا چاہیے۔ دل کا خالی ہونا کبھی کبھی قدرتی ہوتا ہے۔ یہ بات سینکڑوں مرتبہ سمجھا چکا ہوں۔ اس سے آئندہ ترقی ہوتی ہے۔ نہ ہو تو آئندہ ترقی نہ ہو۔ بہر حال میں نے مال (فیض) بھیج دیا ہے۔ امید ہے مل گیا ہوگا۔ گھبرایا نہ کرو۔"

حقوق العباد

(خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ)

تمام حیوانات کی فطرتی صفت ہے کہ اپنے اپنے ہم جنسوں کے ساتھ مل کر رہتے ہیں۔ انسان میں بھی یہ صفت ہے اور بدرجہ اتم ہے۔ حیوانات میں چونکہ عقل نہیں اور ان کی ضروریات زندگی مختصر ہیں اس لئے وہ ابتدائے آفرینش سے جس حالت میں تھے اسی میں آج بھی ہیں۔ لیکن انسان کا حال ان سے مختلف ہے۔ وہ اسی پر بس نہیں کرتا کہ پیٹ بھرنے کو کوئی چیز میسر آ جائے اور گرمی سردی وغیرہ سے بچنے کو مامن موجود ہو۔ بلکہ اسے اور بھی کئی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً لباس کی، درندوں اور دشمنوں سے حفاظت کے لئے ہتھیاروں کی۔ اور اس بات کی کہ جہاں قدرتی طور پر غذا موجود نہ ہو یا موسم کی سختیوں سے بچنے کے لئے مساکن میسر نہ آ سکیں وہاں اپنی عقل خداداد سے کام لے کر یہ چیزیں خود پیدا کرے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس میں ایک صفت یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں چھوٹی سے چھوٹی تکلیف کو بھی بے حد محسوس کرتا اور اس کو دور کر کے زیادہ سے زیادہ آرام حاصل کرنے کی کوشش میں دن رات مصروف عمل رہتا ہے۔ مثلاً ابتداء میں انسان صرف پیدل سفر کرتا اور اپنا بوجھ خود اٹھا کر لے جاتا تھا اس تکلیف سے بچنے کے لئے اس نے جانور سدھائے اور استعمال کئے لیکن جب اس میں بھی تکلیف محسوس ہوئی تو گاڑی بنائی۔ اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو ریل ایجاد کی اور پانی کے جہاز بنائے کچھ دن تو بہت خوش رہا لیکن جلد ہی ان سے بھی اکتا گیا تو موٹر اور آخر کار ہوائی جہاز بنا ڈالا۔ لیکن مطمئن اس پر بھی نہیں ہے۔ اب چاہتا ہے کہ ایسی سواریاں ایجاد کرے جو ان ہوائی جہازوں سے بھی زیادہ سریع السیر اور آرام دہ ہوں اور جو صرف اس زمین ہی پر ہی نہیں بلکہ آسمان میں چاند اور ستاروں تک چشم زدن میں پہنچا سکیں۔ بالغرض یہ بھی ہو گیا تو پھر یہی حضرت انسان یوں فرمائیں گے کہ میاں ان جہازوں میں بیٹھ کر جانے کی جھنجھٹ میں کون پڑے۔ کوئی ایسی ترکیب ہونی چاہیے کہ گھر میں چارپائی پر لیٹے لیٹے جہاں جی چاہا پہنچ گئے۔ چنانچہ یہ نظریہ اس وقت بھی دماغوں میں موجود ہے۔ اور کوشش ہو رہی ہے کہ وائی بریشن کے ذریعہ ٹھوس مادے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کی کوئی ترکیب معلوم کی جائے۔ اور انسان ایک جگہ بیٹھے بیٹھے اس طرح دور دراز مقامات پر پہنچ جائے جیسے ٹیلی ویژن کے نظارے۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ یہ صرف نقل وحمل کے

شعبہ کا ذکر ہے۔ دوسرے شعبوں میں جو کچھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے وہ بھی کچھ کم عجیب نہیں۔ طرح طرح کی مصنوعی غذائیں، لباس، مکانات، اور ہتھیار بنانے کے لئے زمانہ حجریہ سے اب تک جو کچھ ہوا ہے پیش نظر ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے اس کے دھندلے دھندلے سائے ابھی سے نظر آ رہے ہیں۔

الغرض یہ ہے وہ صفت جس کی وجہ سے تمام علوم وجود میں آئے۔ سائنسی انکشافات اور ایجادات ہوئیں اور تمدن ترقی کرتے کرتے وہاں آ پہنچا جہاں آج ہے۔ ظاہر ہے کہ آرام و آسائش کے یہ اسباب و ذرائع ایک اکیلا آدمی کسی طرح بھی مہیا نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے ضروری ہوا کہ بہت سی جماعتیں ایک جگہ مل کر اکٹھی رہیں اور سب ایک دوسرے کی مدد کریں۔ اس طرح بستیوں کی بنیاد پڑی۔ اب چونکہ ہر بستی میں رہنے والی جماعتوں کے کام اور پیشے مختلف لیکن ضروریات زندگی مشترک تھے اس لئے آپس کے میل جول اور لین دین بغیر افراد کا گزارہ ہی ممکن نہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی چونکہ طبائع ایک دوسرے سے مختلف تھیں یعنی کوئی سست اور کاہل تھا تو کوئی چست و چالاک، ایک بیوقوف تھا تو دوسرا عقلمند، ایک ایماندار اور دیانتدار تھا تو دوسرا بے ایمان اور خائن، ایک صلح کل تھا تو دوسرا فسادی اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ مل جل کر رہنے کے کچھ ایسے طریقے مقرر کئے جائیں کہ ہر شخص اطمینان و آرام کی زندگی بسر کر سکے اور اپنی محنت کا پورا فائدہ اٹھا سکے۔ اس بات کو انسان کا خالق پہلے ہی جانتا تھا۔ اور جانتا کیا تھا اس پر فرض تھا کہ جب اس نے انسان کو اپنا خلیفہ بنا کر زمین پر بھیجا تو اس کو اس زمین پر رہنے کے ایسے طریقے بھی بتائے جو اس کی بقاء کے ضامن ہوں۔ اور جن پر عمل کر کے وہ دن رات ترقی کرتا چلا جائے۔ چنانچہ اس خالق نے ابتداء ہی سے ہر ملک و قوم میں منتخب اشخاص کو الہام اور وحی کے ذریعہ یہ طریقے تعلیم کیے۔ اور جب ایک ہی انسان کا پیغام ساری دنیا میں پہنچنے کے ذرائع پیدا ہو گئے تو اس نے ایک مکمل اور آخری دستور حضور سرور کائنات پر نازل فرما کر تمام اہل دنیا تک پہنچا دیا۔ جن برگزیدہ انسانوں پر الہامات ہوئے یا کتابیں نازل کی گئیں وہ نبی یا مرسلین کہلائے اور جو تعلیم اس طرح دی گئی اسی کا نام "مذہب" مشہور ہوا۔ اس تعلیم الٰہی میں تفصیلات کبھی نہیں دی گئیں۔ صرف اصول بتائے گئے تھے تا کہ تفصیلات انسان خود معلوم کر لے اور اس کی ذہنی ترقی رک نہ جائے۔ چنانچہ انہی اصولوں پر انسان کی مختلف قوموں نے اپنی اپنی خصوصیات اور ضروریات کے مطابق

تفصیلات بعد میں خود وضع کر لیں۔ جو لیجسلیچر یا انسانوں کا بنایا ہوا قانون کہلائیں۔ اب جو قوم ان مذہبی یا انسانی قوانین پر جس قدر زیادہ ہم آہنگی اور سرگرمی سے عمل کرتی ہے اتنی ہی زیادہ طاقتور اور خوشحال ہو جاتی ہے۔ اور جس قوم میں یہ ہم آہنگی اور سرگرمی عمل باقی نہیں رہتی وہ کمزور یا فنا ہو جاتی ہے خواہ اس کے قوانین دوسری قوموں سے زیادہ افضل و اعلیٰ ہی کیوں نہ ہوں۔

ہمارا دستور زندگی قرآن ہے اور اس میں ان تمام معاملات کا بیان ہے، جن کے لئے انسانوں کا واسطہ ایک دوسرے سے پڑتا ہے۔ قرآن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان معاملات کی تکمیل کے لئے ہم کو ایک دوسرے سے کیا کیا سلوک کس کس طرح کرنا چاہیے۔ اسی کو معاملات اور اخلاق و آداب کہتے ہیں۔ مسلمانوں نے اخلاق و آداب پر اب تک سینکڑوں قابل قدر کتابیں لکھی ہیں۔ اور آج کل بھی لکھ رہے ہیں لیکن چونکہ یہ کتابیں اکثر اس نظریہ پر مبنی ہوتی ہیں کہ دنیا فانی، ذلیل کتیا، مردود اور مردار لاش ہے اور طالب دنیا ذلیل، کتا، حرام خور اور خدا جانے کیا کیا ہے۔ اس لئے آج کل جبکہ مسلمانوں کے پاس دنیا یعنی دنیاوی نعمتیں اور طاقتیں پہلے ہی بہ منزلہ صفر کے ہیں۔ اس قسم کی کتابوں سے بجائے فائدے کے الٹا نقصان ہوتا ہے۔ یہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اس زمانہ کے بزرگوں کو ایسا ہی لکھنا چاہیے تھا کیونکہ اس وقت نعائم دنیوی کی بہتات سے دین اور ملت خطرے میں تھی۔ لیکن آج جبکہ نعمت ہائے دنیوی کے فقدان سے دین و ملت کو خطرہ لاحق ہے۔ ایسی کتابیں پڑھنا اور شائع کرنا جہاں تک دنیاوی طاقت کے حصول کا تعلق ہے۔ بہت خطرناک ہے۔

اب ہم معاملات و اخلاق کا بیان شروع کرتے ہیں۔ لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی پوری اہمیت کن الفاظ میں ظاہر کریں۔ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ایمان عقائد اور عبادات سب کی غرض و غایت یہ اور صرف یہ ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں میں راحت و آرام کی زندگی حاصل ہو اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک انسان معاملات میں صادق اور اخلاق میں کامل نہ ہو جائے۔ بالفرض کوئی آدمی پانچ وقت نہیں بلکہ دس وقت نماز پڑھے، مہینہ بھر نہیں سال بھر روزے رکھے، ہر سال حج کرے اور زکوٰۃ دے لیکن دوسرے لوگوں کے متعلق اپنے فرائض ادا نہ کرے۔ مثلاً بیوی بچوں کو نان نفقہ سے تنگ رکھے لوگوں کا مال دھوکے سے ہضم کر جائے۔ غیبت کرے، جھوٹ بولے، چوری کرے، رشوت لے، فرائض منصبی دیانت داری سے ادا نہ کرے، کم تولے، کم ناپے،

لوگوں کو لڑائے اور قوم میں تفرقہ ڈلوائے، جو خود مغرور اور مغلوب الغضب ہو۔ دوسروں کو حقیر و ذلیل سمجھے اور ان سے بیہودہ بات کرتا ہو تو ہیں جانتے تو آپ کا کیا خیال ہے وہ مرتے ہی جنت میں چلا جائے گا۔ اور ان بد اعمالیوں کی سزا نہ پائے گا۔ یا دنیا میں اس کو بھی عزت و وقعت اور آرام و سکون کی زندگی میسر آ جائے گی۔ ایسا آدمی مال و دولت کے انبار بھی جمع کر لے تو حقیقی عزت اور قلبی راحت و سکون تو اسے یقیناً اس دنیا میں بھی میسر نہیں آ سکتا۔ اس لئے یاد رکھو اور خوب یاد رکھو کہ معاملات و اخلاق کی جو حدود اللہ نے مقرر کر دی ہیں اور جو طریقے کاروباری کے بتا دیئے ہیں ان پر پوری سرگرمی اور تندہی سے عمل کرنا بھی بالکل اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز، روزہ اور حج و زکوٰۃ وغیرہ۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ تم قرآن کی بعض باتوں پر تو عمل کرو اور بعض پر نہ کرو۔

آگے بڑھنے سے پہلے دو باتیں بتا دینا بہت ہی ضروری ہیں کیونکہ یہی دو باتیں کنجی ہیں تمام کامیابی کی۔ پہلی بات یہ ہے کہ معاملات کی کاروباری میں جو حقوق دوسرے لوگوں کے تم پر عائد ہوتے ہیں۔ ان کو بغیر لیت و لعل اور بلا تعوق و تامل جلد از جلد خوشی خوشی ادا کرو۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمہارے جو حقوق دوسروں کے ذمہ ہیں ان کو ہر حالت میں حاصل کر کے رہو۔ کبھی ڈھیل نہ دو۔ خصوصاً جبکہ ان کا اثر تمہارے اہل و عیال، عزیز و اقربا اور قومی مفاد پر پڑتا ہو۔ اس پچھلی بات پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اگر اس اصول پر عمل کیا جائے تو پھر سخاوت اور ایثار کس کو کہتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ ایثار آپ اپنے ذاتی حقوق کی قربانی سے کر سکتے ہیں۔ اور بے شبہ یہ بہت بڑی نیکی ہے۔ لیکن اپنے متعلقین یا قوم کے حقوق پر دستبردار کر کے دوسروں کی مدد کرنا ہرگز ایثار نہیں بلکہ گناہ ہے۔ ہاں آپ حقداروں کی مرضی اور رضامندی سے ایسا کر سکتے ہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اس زمانہ میں قوم کی زبوں حالی سے ہزارہا آدمی ایسے ہیں جو اہل ہونے کے باوجود کوئی کام نہیں کرتے۔ صرف لوگوں کی سخاوت اور ایثار پر گزارہ کرتے ہیں ایسے لوگوں کے ساتھ سخاوت یا ایثار کرنا قوم کو بے عملی کی دعوت دینا ہے۔ اس لئے ایثار صرف اپنے ذاتی حقوق کی قربانی سے کیا جائے۔ اور وہ بھی صرف ان کے لئے جو اہل ہوں۔ نااہلوں کے لئے ایثار کرنا سخت نقصان دہ ہے۔ یہ دو باتیں بہت اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کے بعد اب آگے چلئے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ باہمی معاملات اور اخلاق کی ابتداء گھر سے ہوتی ہے یا یوں کہیے کہ گھر ہی تمدن کی سب سے چھوٹی

یونٹ ہے اس لئے جتنی یہ یونٹ اچھی، مضبوط، مکمل اور نقائص سے پاک ہوگی۔ اتنا ہی قومی تمدن اعلیٰ وارفع اور دنیا میں طاقت عزت وعظمت اور ترقی کا باعث ہوگا۔ اس لئے ہم گھر ہی سے اپنے بیان کی ابتدا کرتے ہیں۔

گھر

یہاں " گھر " سے مراد خاوند بیوی اور ان کے بچے ہیں خواہ وہ کسی محل میں رہتے ہوں یا جھونپڑی میں۔ دراصل گھر بنتا ہے ایک مرد اور ایک عورت کے ایسے معاہدے سے جس میں وہ اپنے مذہبی یا قومی دستور کے مطابق یہ عہد کریں کہ ہم میاں بیوی کی طرح اکٹھے رہیں گے۔ اس معاہدے کے معرض وجود میں آتے ہی دونوں پر کچھ حقوق وفرائض عائد ہو جاتے ہیں۔ اب جس قدر وہ دونوں ان حقوق وفرائض کو بوجوہ احسن خوبی اور تندہی سے انجام دیں گے اسی قدر راحت و سکون سے رہیں گے۔ اور یہ گھر جنت بن جائے گا۔ برخلاف ازیں جس قدر وہ ان حقوق وفرائض کی طرف سے روگردانی اور بے پروائی کریں گے۔ اتنی ہی زندگی مصیبت اور تکلیف سے کٹے گی اور یہی گھر ان کے لئے جہنم ہو جائے گا۔ ان میں کچھ حقوق وفرائض میاں بیوی دونوں پر مشترکہ حیثیت سے عائد ہوتے ہیں اس لئے ہم پہلے انہی کا بیان کریں گے۔

(۱) دونوں کا سب سے پہلا اور سب سے اہم مشترکہ فرض یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو پہلے ہی دن سے اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں۔ اور اپنے مزاج اور عادتوں میں مناسب تغیر و تبدل کر کے ہم مزاج اور ہم خیال بن جائیں۔ یہ کام کتنا ہی مشکل نظر آئے آئندہ زندگی کو خوشگوار اور کامیاب بنانے کے لئے اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانا اشد ضروری اور لازمی ہے۔ اس کام کو آسانی سے سرانجام دینے کے لئے ایک دوسرے کی چھوٹی چھوٹی فروگذاشتوں کو بالکل نظرانداز کر دینا اور بڑے بڑے اختلافات کو محبت اور پیار سے ایک دوسرے کو بتا دینا چاہیے۔ بتاتے وقت طبیعت میں غصہ اور انداز بیان میں درشتی اور شکایت کا شائبہ بھی نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ الٹا اثر پڑے گا، اور بنتا کام بگڑ جائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ پہلے ہی دن دونوں آپس میں سمجھوتہ کر لیں۔ جس کو بھی دوسرے کی کوئی بات ناگوار ہوگی۔ صاف صاف بتا دے گا دل میں نہ رکھے گا۔ کیونکہ اس سے غلط فہمیاں پیدا ہو کر رائی کا پہاڑ بن جاتا ہے اگر دو چار ماہ یہ عمل کیا جائے۔ اور انتہائی صبر اور قوت برداشت سے کام لیا جائے۔ تو زیادہ عرصہ نہ گزرے گا کہ گرہستی کی گاڑی زندگی کی شاہراہ

پر فراٹے بھرنے لگے گی۔ اور باقی عمر جو ممکن ہے پچاس ساٹھ برس سے بھی زیادہ ہو بہت آرام و آسائش اور لطف وراحت سے بسر ہوگی۔ کس قدر احمق ہیں وہ لوگ جو شادی کے بعد ذرا ذرا سی شکایتوں اور بدگمانیوں کی وجہ سے اپنی زندگی کو تلخ اور اپنے جنت کدہ کو جہنم بنا لیتے ہیں۔ اور پھر الزام قسمت اور خدا کو دیتے ہیں۔

(۲) جس مکان میں رہتے ہیں اس کو صاف ستھرا رکھنا اور اس کی مرمت لپائی پوتائی اور سفیدی وغیرہ کراتے رہنا۔ میاں بیوی دونوں کا مشترکہ فرض ہے۔ خواہ یہ صفائی وغیرہ نوکروں کے ذریعہ کرائی جائے یا خود کرنی پڑے۔ عام طور پر مرد اس کو اپنے فرائض میں سے نہیں سمجھتے۔ لیکن یہ ان کی غلطی ہے۔ میاں بیوی دونوں برابر حیثیت سے اس کے مکین ہیں اور اس لحاظ سے خاوند پر بھی اس مکان کا اتنا ہی حق ہے جتنا بیوی پر۔

(۳) جو اولاد پیدا ہو اس کی پرورش، تربیت اور تعلیم کی ذمہ داری میاں بیوی دونوں ہی پر عائد ہوتی ہے۔ دونوں کو آپس میں پوری دل چسپی لینی اور اپنی حیثیت اور توفیق کے مطابق اس میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھنی چاہیے۔

(۴) مکان میں خاوند یا بیوی کے جو رشتہ دار رہتے ہوں۔ ان کی خاطر و خدمت دونوں کا مشترکہ فرض ہے یہ ہرگز جائز نہیں اگر وہ لوگ خاوند کے رشتہ دار ہیں تو بیوی کو برا لگے اور اگر بیوی کے رشتہ دار ہیں تو خاوند کو ناگوار ہو۔

(۵) مکان میں جو لوگ بطور مہمان آئیں ان کی خاطر تواضع بھی دونوں ہی پر برابر فرض ہے مہمان چاہے خاوند کے ہوں یا بیوی کے دونوں کو ان کی مدارات برابر کرنی چاہیے اس کے برخلاف کرنا شرافت کے خلاف ہے۔

(۶) میاں اور بیوی کے درمیان کوئی راز اور کوئی تکلف نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اس رشتہ میں بھی تکلف باقی رہا تو پھر بے تکلفی کا لفظ ہی بے معنی ہے۔ (جاری)

(از تعمیر ملت)

صدیق اکبرؓ کا پہلا خطبہ

(مولانا شاہ محمد جعفر پھلواری)

(خلیفہ اول سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے پہلے خطبہ خلافت کو تاریخ اسلام میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ اس میں جناب صدیقؓ نے سیاست، معاشرت، قانون اور اخلاق کے جن اصولوں کی تشریح فرمائی ہے وہ اسلامی معاشرے اور اسلامی حکومت کی تشکیل میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔)

جناب صدیق اکبرؓ کے اس خطبے کی عمرانی تشریح سننے سے پہلے ایک ضروری بات ذہن نشین کر لینی چاہیے۔ اور وہ یہ ہے کہ عملی اور فعال قسم کے لوگوں کے خطبے طویل نہیں ہوا کرتے۔ اور قرون اولیٰ کے خطبات تو اتنے مختصر ہوا کرتے تھے کہ اہم سے اہم خطبے بھی دو ایک منٹ سے زیادہ وقت نہ لیتے۔ اس اختصار کی بڑی وجہ ہے کہ اس دور کا تمدن آج کی طرح شاخ در شاخ پھیلا ہوا نہ تھا۔ جس کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالنے کے لئے تقریر کو طول دینا پڑے۔ دوسرا سبب اس اختصار کا یہ ہے کہ ان کے سامنے کام زیادہ اور باتیں کم تھیں۔ آج بعض اوقات ہم یہ سنتے ہیں کہ فلاں صاحب نے نوے منٹ تقریر کی، فلاں شخص نے چھ گھنٹے کا خطبہ صدارت پڑھا اور فلاں مقرر نو گھنٹے مسلسل کمال خطابت دکھاتا رہا تو ہمیں زیادہ تعجب نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ ہمیں قرن اول کے رہنماؤں کے متعلق بھی ایسا ہی گمان ہو کہ وہ بڑے فصیح و بلیغ عرب تھے لہٰذا وہ بھی اسی طرح گھنٹوں اپنے فن خطابت کے کمالات دکھایا کرتے ہوں گے۔ لیکن واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ خلفائے راشدین نمونہ تھے نبویؐ زندگی کا۔ اور خود نبویؐ زندگی میں ہمیں کوئی طویل خطبہ نہیں ملتا۔ خلفائے راشدین بھی اس معاملے میں حضورؐ ہی کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ وہ اپنی عملی زندگی کے خلا کو تقریری چاشنیوں سے پر کرنے کے قائل نہ تھے بے ضرورت اور غیر مفید گفتگوؤں کے لئے ان کے پاس وقت ہی نہ تھا۔ اس لئے وہ جو کچھ بھی کہتے وہ **ماقل و دل** کا نمونہ ہوتا یعنی تھوڑے وقت اور کم سے کم الفاظ میں اپنے مطالب کو سمجھا دیتے۔ اس کے باوجود ان کے چند جملوں میں خطابت کے تمام شرائط کمال سمٹ کر آ جاتے تھے، جناب صدیق اکبرؓ کے خطبہ خلافت کو بھی اسی نگاہ سے دیکھنا چاہیے کہ ایک سو فیصد عملی رہنما تھوڑے سے وقت میں چند ایسے بنیادی حقائق کو سمجھا رہا ہے جن کے بغیر نہ اعلیٰ سوسائٹی بن سکتی ہے نہ کسی ستھرے نظام مملکت کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

پھر مخاطب وہ امت ہے جسے نبوی تربیت نے ذہن رسا بخشا ہے ایسا ذہن رسا جو طوالت بیان کا محتاج ہی نہیں۔

اب جناب صدیق اکبرؓ کے اس خطبے کو سنیے جو آپ نے انتخاب خلافت کے بعد ہی پہلی مرتبہ دیا ہے۔ ہم اس کے ایک ایک ٹکڑے کو نقل کر کے الگ الگ بتائیں گے کہ معاشری زندگی کے لئے یہ کس درجے ضروری اور اساسی باتیں ہیں۔

محمد بن اسحٰق بن یسار نے حضرت انس بن مالک کی روایت سے یہ خطبہ صدیقی یوں نقل کیا ہے کہ آپ نے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء فرمائی۔ اسلامی اور غیر اسلامی زندگی میں سب سے بڑا بنیادی فرق یہی ہے کہ اسلام میں اس کا آغاز وانجام سب کچھ ہدایت خداوندی سے وابستہ ہوتا ہے۔ اور غیر اسلامی نظام میں خدا سے کامل بے تعلقی ہوتی ہے۔ حمد خداوندی کے بعد آپ نے پہلی بات یہ فرمائی کہ:

ایها الناس انی ولیت علیکم ولست بخیر کم٥

"اے لوگو! میں تمھارا والی وامیر بنایا گیا ہوں لیکن میں تم سے برتر نہیں ہوں"

ایک اسلامی معاشرے میں جس انداز کا نظام مملکت ہونا چاہیے اس کا بنیادی تصور یہ ہے کہ اس میں قانون کے آگے ہر فرد یکساں ہے۔ کوئی کسی سے برتر و بہتر نہیں۔ امیر یا خلیفہ بننے سے کوئی شخص قانون سے بالاتر نہیں ہو جاتا۔ وہ صرف افراد مملکت کی نگرانی کی خدمت انجام دیتا ہے ورنہ اس میں اور عوام میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ یہ تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ذرا سی حکومت ہاتھ آجائے تو انسان کا دماغ نہیں ملتا۔ اس میں تعلّی آجاتی ہے اور وہ اپنے آپ کو عوام سے بالاتر تصور کرنے لگتا ہے۔ یہی وہ رعونت ہے جو انسانی معاشرے کو حاکم ومحکوم کے دو طبقوں میں بانٹ دیتی ہے اور یہ خلیج جتنی زیادہ وسیع ہوتی جاتی ہے اسی قدر سوسائٹی میں گھن لگتا جاتا ہے۔ جناب صدیق اکبرؓ نے اس حقیقت کو واشگاف کیا ہے کہ اس اسلامی معاشرے میں آقا وغلام، بادشاہ و رعایا اور حاکم ومحکوم کا کوئی تصور نہیں۔ یہاں سب بھائی بھائی ہیں اور سب مساوی حقوق رکھتے ہیں۔ ذرا بتایئے ایک اعلیٰ سوسائٹی کا کیا اس سے بھی بہتر تصور ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا:-

"فان احسنت فاعینونی و ان اسات فقومونی"

"اگر میں اچھے کام کروں تو میری مدد کرو اور اگر برائی کروں تو مجھے سیدھا کر دو"

ذرا یہ ذہن میں رکھیے کہ ایک فرمانروا یہ باتیں اس عہد میں کر رہا ہے جب کہ فرمانروائی کا مطلب ہی قیصری و کسروی جبر و استبداد تھا۔ افراد مملکت کو ضمیر کی یہ آزادی اور کس نے کبھی دی ہے؟ اب تو یہ مسلم ہو گیا ہے کہ اعلیٰ معاشرہ وہی ہے جہاں حریت ضمیر کی نعمت حاصل ہو اور اپنی ہی صحیح و غلط باتوں کو جبر و استبداد سے منوانے کا فرعونی جذبہ نہ ہو۔ یورپ کی پادشاہیوں میں آج بھی یہ اصول تسلیم شدہ ہے کہ پادشاہ غلطی نہیں کرتا (Kingnevererrs) لیکن صدیق اکبرؓ کی راست بازی و فراخ حوصلگی کو دیکھئے وہ کیسی صاف گوئی سے فرمارہے ہیں کہ غلطی مجھ سے بھی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا جب ایسا کروں تو مجھے سیدھا کر دو اور امداد نیک ہی کاموں میں کرو۔

پھر فرمایا:-

"الصدق امانة و الكذب خيانة"

"سچائی امانت ہے اور دروغ خیانت ہے"

یہ ایک ایسی صحیح حقیقت ہے جو ہمیشہ سے تسلیم شدہ ہے اور کبھی اس میں ترمیم و اضافہ نہ ہو سکے گا۔ یہ ایسا اخلاقی درس ہے جو ہر اعلیٰ سوسائٹی کی جان ہے۔ جس معاشرے میں امانت صدق کی محافظت کی جائے اس کے سنورنے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا اور جس سوسائٹی میں دروغ فروغ پا جائے اس کی بربادی میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد آپ نے مملکتی فرائض کے سمندر کو کوزے میں بند کرتے ہوئے فرمایا کہ:-

" الضعيف فيكم قوى عندى حتىٰ ارجع عليه حقه ان شاء الله، والقوى فيكم ضعيف حتىٰ اٰخذالحق منه ان شاء الله"

"یعنی تم میں جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے تا آنکہ اس کا حق اسے واپس دلوا دوں ان شاء اللہ اور جو تم میں طاقتور ہے وہ بے زور ہے، یہاں تک کہ میں اس سے حق اگلوا دوں ان شاءاللہ"

یہاں ذرا غور سے کام لیجئے۔ ایک اعلیٰ معاشرے کا تصور کیا ہو سکتا ہے؟ یہی کہ اس میں عدل کے تقاضے پورے ہوتے ہوں۔ کوئی طاقتور کمزور کا حق نہ چھین سکے۔ اور اگر ایسا کرے تو بے بس مظلوم کی دادرسی ہو اور اس کا سلب کیا ہوا حق واپس دلوا دیا جائے اور ظالم طاقتور کو اس کے ظلم کی

پاداش سے مفر نہ ہو سکے۔ اس کے ہاتھ باندھ دیے جائیں اور اسے کیفر کردار تک پہنچا دیا جائے۔ وہ مملکت اور سوسائٹی ہی کیا جہاں قانون کمزوروں کو تو اپنی گرفت میں لے لے اور طاقتوروں سے چشم پوشی کر جائے؟ جہاں ظالموں کا ظلم نہ دور کیا جائے اور مظلوم کمزوروں کی کوئی حمایت نہ کی جائے؟ یہی تو ہے وہ مخصوص صفت جو ایک ریاست کو عادلانہ ریاست اور ایک معاشرے کو اعلیٰ معاشرہ بناتی ہے۔ یہی ہے وہ اصل فریضہ ءامیر وخلیفہ جس کا اعلان جناب صدیقؓ نے اپنے پہلے خطبہ خلافت میں فرمایا۔

یہاں آگے چلنے سے پہلے ایک اور نکتے کو بھی سمجھ لینا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنا یہ فریضہ بیان کرتے ہوئے دو جگہ لفظ **ان شاء اللہ** فرمایا ہے۔ ہمارے ہاں اس لفظ کا استعمال عزم کی ناپختگی اور ارادے کے ڈھیلے پن کی غمازی کرتا ہے۔ یعنی جب کوئی وعدہ مشکوک ہو یا ارادہ پختہ نہ تو "**ان شاء اللہ**" کہہ دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اب کسی کام کے کرنے نہ کرنے میں فی الجملہ آزادی حاصل ہوگئی یا یہ کہ اب اتنی زیادہ پابندی نہیں رہی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ انشاءاللہ کا یہ مفہوم ہی نہیں۔ اس کا مطلب صرف اسی قدر ہے کہ اپنی طرف سے تو تکمیل کرنے کی ہر ممکن کوشش ہوگی اور کوئی کوتاہی نہیں کی جائے گی لیکن اگر اچانک مشیت الٰہی کوئی ایسی رکاوٹ پیدا کر دے جس کو دور کرنا اپنے بس کی بات نہ ہو تو ظاہر ہے کہ اسے کوتاہی، غفلت، بے اعتنائی یا ترک کوشش نہیں کہا جائے گا۔ ان شاءاللہ کا صرف یہی مفہوم ہے نہ کہ ارادے کا ڈھیلا پن۔ یہ حکم قرآنی بھی ہے کہ "**ولا تقولن لشیء انی فاعل ذٰلک غداً الا ان یشاء اللہ**" یعنی بغیر ان شاءاللہ کہے یہ دعویٰ مت کرو کہ میں کل فلاں کام ضرور کروں گا۔ یہ لفظ انسان کے ادعا اور تکبر کو دور کرنے کے لئے ہے نہ کہ ارادے کو کمزور کرنے کے لئے۔

اس کے بعد جناب صدیق اکبرؓ نے زندگی کا ایک گر بتایا جس کے بغیر کوئی معاشرہ پنپ نہیں سکتا۔ فرمایا:-

"لایدع قوم الجهاد فی سبیل الله الاخذهم الله بالذل"

"جو قوم بھی جہاد فی سبیل اللہ کو چھوڑ بیٹھے اسے خدا بھی ذلت سے ہمکنار کر کے چھوڑ دیتا ہے"

جہاد سے مراد محض قتال و جنگ نہیں۔ جہاد کہتے ہیں جہد بلیغ اور انتہائی کوشش کو۔ جہاد سے ہی خاندان، علم، عزت، حرمت سب کچھ حاصل ہوتا ہے۔ یعنی غرض جس چیز کو بھی آپ اعلیٰ اقدار کے لئے پیش نظر رکھیں گے وہ جہاد فی سبیل اللہ ہو گا۔ جو قومیں جہاد کی صلاحیت بھی مردہ ہو جاتی ہے اور وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور جاندار قوموں میں یہی خصوصیت جہاد کہلاتی ہے۔

اس کے بعد حضرت صدیقؓ نے معاشرے کی بقاء کے لئے ایک اعلیٰ اخلاقی درس یہ عطا کیا کہ:

"لا تشیع الفاحشة فی قوم الا عمهم الله بالبلاء"

"جس قوم میں بے حیائی کی باتیں پھیل جائیں اس میں خدا ابتلاؤں کو عام کر دیتا ہے"

کسی سوسائٹی کے لئے بے حیائی کی باتوں سے زیادہ مہلک اور کوئی چیز تباہ کن نہیں ہوتی۔ یہ حقیقت کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ اس لئے آپ نے اس سے بھی قوم کو خبردار کر دیا۔

اس کے بعد حضرت صدیقؓ نے ایک ایسی بات فرمائی جو ایک خدا پرست کے سوا کوئی نہیں کہہ سکتا۔ خدا پرست بھی ایسا جس کے دل کے کسی گوشے میں ہوسِ اقتدار اور سودائے حکومت کی کوئی رمق بھی موجود نہ ہو۔ فرمانروایانِ ملک اپنی اطاعت کس طرح کراتے ہیں اور اپنی ہر جائز و ناجائز خواہش کی تعمیل کیونکر کراتے ہیں اور اس مقصد کے لئے کیونکر ظلم و جبر کے کیا کیا حربے استعمال کرتے ہیں۔ یہ تمام باتیں فنِ تاریخ کے ابتدائی طالب علم سے بھی پوشیدہ نہیں۔ لیکن سیدنا صدیقِ اکبرؓ کیا فرماتے ہیں اسے بھی سن لیجئے۔

"اطیعونی ما اطعت الله ورسوله فاذا عصیت الله ورسوله فلا طاعة لی علیکم"

"جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا رہوں تم بھی میری اطاعت کرو۔ اور اگر میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر میری کوئی اطاعت واجب نہیں"

اللہ اکبر، اطاعت الٰہی کی پابندی کی شرط کے ساتھ حریت ضمیر کا یہ کتنا عظیم الشان اعلان ہے۔ کیا آج دنیا کا کوئی "چارٹر" پیش کیا جا سکتا ہے جو قوموں کی آزادی کی ضمانت میں اور شخصیت پرستی کی نفی میں اس سے زیادہ واضح، جامع اور بہتر صراحت ہو؟ کیا ایک معاشرے کے جمہوری

نظام کو اعلیٰ ترین منزل پر پہنچانے کے لئے اس سے برتر ہدایت واصول کی تلاش ممکن ہے؟ یہی ایک اسلامی ریاست کی اساس ہے۔ جس کی طرف دنیا کی متمدن قومیں خود بخود کشاں کشاں چلی آ رہی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ انہوں نے الٰہی کی اساسی برتری کو ابھی تسلیم نہیں کیا ہے۔ لیکن نفس قانون کی بالاتری و برتری کو مان لیا ہے۔ اگر چہ ابھی تک عملاً اس کے بھی کئی گوشے تشنہ ہی ہیں۔ جناب صدیق اکبرؓ نے اپنے اس اعلان میں ایک بڑی بنیادی حقیقت کی پردہ کشائی فرمائی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک اچھا معاشرہ غیر مسلم قوم میں بھی ہوسکتا ہے لیکن ایک اعلیٰ اسلامی سوسائٹی بنیادی طور پر اس سے مختلف ہوتی ہے۔ وہاں اطاعت صرف قانون کی ہوتی ہے جو انسان ہی وضع کرتے ہیں اور یہاں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت ہوتی ہے۔ اور امیر یا خلیفہ اسی کی اطاعت کراتا ہے اور خود بھی اسی کا پابند رہتا ہے۔

اس کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ نے جو آخری بات فرمائی وہ یہ تھی کہ :-

"قوموا الیٰ صلاتکم یرحمکم اللہ"

"اپنی نماز کے لئے کھڑے ہو جاؤ اللہ تم پر رحم فرمائے گا"۔

ممکن ہے یہ کسی نماز کا وقت ہو یا شکرانے کی نماز ادا کرنی مقصود ہو۔ لیکن یہ خود یاد رکھنا چاہیے کہ یہ "دو رکعت کی امامت" نہیں تھی۔ صلوٰۃ تو اہل اسلام کے اجتماعی نظام کا ایک عملی نمونہ اور اس کی لگا تار ٹریننگ یا تربیت و مشق ہے۔ جس میں ایک ذہنی ہم آہنگی کے لئے منتشر قوتوں کو یک جا اور منظم کیا جاتا ہے، بلند و پست کی تفریق کو ختم کیا جاتا ہے، اطاعت امیر کی عادت ڈالی جاتی ہے اور اگر امام غلطی کرے تو اسے لقمہ دے دیا جاتا ہے اور ان تمام قدروں کو صرف مسجد کی چار دیواری تک محدود نہیں رکھا جاتا، بلکہ ساری انفرادی و اجتماعی زندگی پر پھیلانا مقصود ہوتا ہے۔ غرض نظام صلوٰۃ تمام روحانی وسیاسی اقدار کا جامع ہے۔ یہی اسلام کی عمرانی زندگی کی ابتداء اور یہی انتہا ہے۔ جس کی طرف سیدنا صدیق اکبرؓ نے قوم کو توجہ دلائی ہے۔ علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

غرض آپ کا یہ پہلا خطبہ خلافت ایک اعلیٰ عمرانی زندگی کے لئے ایسا جامع ہدایت نامہ ہے جس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

اعجاز القرآن

عظیم و برتر خدا کا نظام

(محمد صدیق ڈار توحیدی)

اس کی ایک ہی توجیح ہے جو اس حقیقت پر مبنی ہے کہ یہ سارا نظام اس علیم وخبیر ذات کا اپنا ترتیب دیا ہوا ہے اور قرآن مجید فرقان حمید اللہ عالم الغیب کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ جب تک اس ذات کریم نے چاہا یہ حسابی نظام اسراریت کے پردوں میں چھپا رہا اور 1400 سال بعد اس نے جب اس راز کو ظاہر کرنا چاہا تو یہ پردہ اٹھا دیا تا کہ اس کے آخری رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دائمی معجزہ تمام دنیا کے انسانوں کے سامنے نئے انداز سے ظاہر ہو جائے اور یہ ابدی حقیقت ثابت ہو جائے کہ یہ کتاب اللہ کا کلام ہے اور بغیر کسی کمی و کجی اور تنسیخ و ترمیم کے اپنی اصل حالت میں محفوظ ہے۔ قرآن کریم جیسی ضخیم کتاب کو ایک ایک حرف کی گنتی اور انکی تعداد کا لحاظ رکھتے ہوئے ترتیب دینے کا انتہائی نازک کام اللہ کی ذات کے سوا اور کون انجام دے سکتا تھا۔

یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ حروف مقطعات تو سورتوں کے آغاز ہی میں نازل کر دیئے جاتے تھے اور بعد میں تھوڑی تھوڑی آیات اترتی رہتی تھیں اور اللہ کے حکم کے مطابق مختلف سورتوں میں ڈال دی جاتی تھیں۔ اللہ لطیف وخبیر کے سوا اور کون جان سکتا تھا کہ حروف مقطعات والی سورت جب پوری ہو جائے گی تو اس میں ان خاص حروف کی تعداد ٹھیک اتنی ہی ہو گی جو انیس پر تقسیم ہو جائے۔ سورۃ قٓ اور سورۃ الشوریٰ جن کا طوالت کے لحاظ سے آپس میں اڑھائی گنا سے زیادہ فرق ہے ان میں حرف قاف (ق) کی تعداد برابر برابر رکھنے کا بندوبست اللہ ہی کر سکتا تھا۔

حروف، سیٹ اور سورتیں

حروف مقطعات کے نظام میں مندرجہ ذیل حقائق بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔

1- عربی زبان کے 28 حروف ابجد میں سے صرف 14 حروف مقطعات کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ وہ حروف یہ ہیں:-

ا، ح، ر، س، ص، ط، ع، ق، ك، ل، م، ن، ہ، ی۔

2- ان حروف سے بننے والے سیٹ جو مختلف سورتوں کے شروع میں آئے ہیں ان کی تعداد

بھی 14 ہے اور وہ یہ ہیں:-

قٓ، نٓ، صٓ، طٰہٰ، یٰسٓ، طٰسٓ، حٰمٓ، الٓمٓ، الٓرٰ، طٰسٓمٓ، عٓسٓقٓ، الٓمٓرٰ، الٓمٓصٓ، کٓھٰیٰعٓصٓ

3- جن سورتوں کے آغاز میں حروف مقطعات آئے ہیں ان کی تعداد 29 ہے۔ انکا شمار یوں ہے:-

20,19,15,14,13,12,11,10,7,3,2

38,36,32,31,30,29,28,27,26

68,50,46,45,44,43,42,41,40

مندرجہ بالا تینوں پہلوؤں کا 19 کی عددی کلید کے ساتھ بھی ایک تعلق موجود ہے۔ کیونکہ جب ہم اس نظام میں استعمال ہونے والے حروف، حروف کے سیٹوں کی تعداد اور سورتوں کی تعداد کو جمع کرتے ہیں تو (14+14+29) تو 57 کا عدد حاصل ہوتا ہے جو کہ 19 پر تقسیم ہو جاتا ہے۔ (3x19=57)

اگر ہم سورتوں کی ترتیب اور تسلسل کے لحاظ سے ان کے سیٹ بنائیں تو خط کشیدہ سورتوں کے دس سیٹ بن جائیں گے۔ اب اگر ہم حروف کی تعداد، حروف کے سیٹوں کی تعداد اور سورتوں کے سیٹوں کی تعداد کو جمع کریں تو ان کا حاصل جمع (14+14+10) 38 ہوگا اور یہ عدد بھی 19 پر تقسیم ہو جاتا ہے (2x19=38)

اہم اصول کی وضاحت

حروف مقطعات والی کئی سورتوں کے شروع میں صرف ایک حرف آیا ہے کئی میں دو اور اکثر کے شروع میں دو سے زیادہ حروف آئے ہیں۔ کئی سیٹ صرف ایک ہی مرتبہ استعمال ہوئے ہیں اور کئی بار بار استعمال ہوئے ہیں۔ اس نوع کی تبدیلی کے ساتھ سورتوں میں حروف کی تعداد کا مجموعہ بنانے کا طریقہ بھی بدلتا جائے گا جس کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔

1- جب اکیلا حرف صرف ایک ہی سورت کے شروع میں آئے گا تو اس سورت کے اندر اس مخصوص حرف کی تعداد لازمی طور پر اتنی ہی ہوگی جو 19 پر تقسیم ہو سکے۔ جیسا کہ حرف قاف (ق)

اور نون (ن) کے بارے میں آپ ملاحظہ کریں گے۔ لیکن اگر وہی حرف کسی دوسری سورت کے شروع میں بھی آیا ہو پھر صرف ایک سورت کا مجموعہ 19 پر تقسیم نہ ہوگا بلکہ ان ساری سورتوں میں اس حرف کا مجموعہ 19 پر تقسیم ہوگا۔ اس کی مثال آپ حرف صاد (ص) کے ضمن میں دیکھیں گے۔

2- اسی طرح دو حروف والے مقطعات جو صرف ایک ہی سورت کے شروع میں آئے ہیں ان کا افقی مجموعہ اس سورت کے اندر بھی 19 پر تقسیم ہوگا جیسے سورۃ طٰہٰ میں طا (ط) اور ہا (ہ) کا مجموعہ اور سورۃ یٰس میں یا (ی) اور سین (س) کا افقی مجموعہ لازمی طور پر 19 پر تقسیم ہوگا۔ لیکن حٰمٓ چونکہ سات سورتوں کے شروع میں آیا ہے اس لئے فرداً فرداً ہر سورت میں حا (ح) اور میم (م) کی تعداد 19 پر تقسیم نہیں ہوگی بلکہ ساتوں سورتوں میں حا اور میم کا عمودی مجموعہ 19 پر تقسیم ہوگا۔ اس کا مشاہدہ آپ جدول نمبر...3... میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

3- یہی اصول دو سے زیادہ حروف والے مقطعات پر بھی منضبط ہوگا۔ آپ جدول نمبر ...4... میں ملاحظہ فرمائیں گے کہ المٓصٓ سورۃ الاعراف کے سوا کسی دوسری سورت کے شروع میں نہیں آیا اس لئے اس سورت کے اندر (ا، ل، م، اور ص) کی تعداد (5358=98+1165+1523+2572) کا مجموعہ 5358 بنتا ہے اور یہ رقم 19 پر تقسیم ہو جاتی ہے۔ (282x19=5358) اسی طرح المٓرٓ چونکہ صرف سورت الرعد کے شروع میں آیا ہے اس لئے حروف کی تعداد کا مجموعہ اس سورت میں 1501 بنتا ہے جو 19 پر تقسیم ہو جاتا ہے۔ (79x19=1501)

4- جو حروف مقطعات ایک سے زیادہ سورتوں کے شروع میں استعمال ہوئے ہیں جب ان ساری سورتوں میں آنے والے حروف کا عمودی مجموعہ کیا جائے گا تو ہر ہر حرف کا مجموعہ 19 پر تقسیم ہو جائے گا۔ ملاحظہ فرمائیے جدول نمبر 3 اور 4

دو حیرت انگیز مثالیں

حروف مقطعات کی تعداد کو پوری سورت کے اندر 19 پر قابل تقسیم رکھنے کے لئے قرآن کریم میں دو ایسی مثالیں ہیں جن پر غور کرنے سے ایک مومن کا ایمان مزید مستحکم ہو جاتا ہے کہ اللہ

تعالیٰ کی اس عظیم کتاب کا ایک ایک حرف گنا چنا اور نپا تلا ہے اور اللہ کی یہ آخری کتاب ہر قسم کی تحریف سے محفوظ اور ترمیم سے پاک ہے۔

پہلی مثال

پہلی مثال سورت قٓ میں آیت نمبر 13 کی ہے۔اس آیت کے الفاظ یہ ہیں۔ **وعاد وفرعون و اخوان لوط ٥** "اس سے پہلے جھٹلایا عاد نے اور فرعون نے اور برادران لوط نے "اس آیت کا لفظ "اخوان لوط" خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔قرآن کریم میں حضرت لوط علیہ السلام کے لوگوں کا ذکر بارہ مرتبہ آیا ہے اور ہر جگہ انہیں قوم لوط کہا گیا ہے۔صرف اس آیت میں انہیں اخوان لوط کہا گیا ہے۔اس استثناء کی آخر کوئی خاص وجہ تو ضرور ہوگی۔اس امر پر جب ہم حروف مقطعات کا پس منظر میں غور کرتے ہیں تو اس کی خاص الخاص اور ایمان افروز وجہ یہ سامنے آتی ہے کہ اگر اس سورت کی آیت نمبر 13 میں قوم لوط آجاتا تو حرف قاف (ق) سے شروع ہونے والی اس سورت میں قاف کی موجودہ میزان جو کہ 57 ہے اور انیس پر تقسیم ہو جاتی ہے تبدیل ہو کر 58 ہو جاتی اور 19 کے ہندسے والی الہامی عددی کلید کا نظام اس پر منطبق نہ ہو سکتا۔

دوسری مثال

دوسری مثال اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے۔اس سے جہاں الہامی عددی کلید کے نظام کی تصدیق ہوتی ہے وہاں سورت الاعراف کی آیت نمبر 69 میں آنے والے ایک مخصوص لفظ "**بسطۃً**" کی عقدہ کشائی بھی ہو جاتی ہے۔یہ لفظ یہاں "ص" کے ساتھ لکھا گیا ہے حالانکہ عربی لغت میں "**بسط**" کا مادہ یعنی مصدر ہی موجود نہیں ہے۔اصل لفظ "**بسط**" سے "**بسطۃً**" ہے۔چنانچہ اردو میں بھی لفظ بسیط استعمال ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن کے متن میں جب **بسطۃ** لکھا جاتا ہے تو اس کے اوپر ایک سین (س) ضرور ہوا ہوتا ہے۔جو یہ ظاہر کرنے کے لئے ہوتا ہے کہ اللہ کے حکم سے اس لفظ کو صاد (ص) سے لکھا گیا ہے لیکن حقیقت میں یہ سین (س) ہے۔اس قسم کی تحریر کو علماء **توقیفیہ** کہتے ہیں۔یعنی جبرائیل علیہ السلام جب یہ آیت لے کر آئے تو انہوں نے اللہ کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ہدایت کر دی کہ اپنے کاتبان وحی کو فرما

دیں کہ اس لفظ کو سین (س) کی بجائے صاد (ص) سے لکھنا ہے۔ اس خاص حکم کی وضاحت اور صحیح لفظ کی بجائے غیر مستعمل لفظ ڈالنے کی کوئی تشریح نہیں کی گئی تھی۔ لیکن حروف مقطعات کا راز کھل جانے سے یہ معمہ بھی حل ہو گیا ہے۔ اگر یہ لفظ اپنی صحیح صورت میں **بسطۃ** لکھا جاتا تو صاد (ص) کی تعداد جو کہ اس وقت 152 (8x19) ہے کم ہو کر 151 رہ جاتی جو انیس پر تقسیم نہیں ہو سکتی تھی۔ اس طرح 19 کی الہامی عددی کلید سے ظاہر ہونے والی معجزاتی شہادت ناکام ہو جاتی۔ اللہ علیم و خبیر نے اپنی حکمت کاملہ سے الفاظ و حروف کے اس نظام کو اس طرح مربوط و منظم فرمایا کہ جب یہ راز کھل کر سامنے آئے تو کسی سلیم الطبع انسان کے لئے اس حقیقت کو ماننے بغیر کوئی چارہ باقی نہ رہے کہ یہ کتاب حقیقتاً اللہ کی نازل کی ہوئی ہے اور ہر قسم کی کمی بیشی، کانٹ چھانٹ، تبدیلی اور تحریف سے قطعی محفوظ ہے۔

منفرد حروف مقطعات

قرآن مجید فرقان حمید کی چند سورتیں ایسی ہیں جن کے شروع میں صرف ایک ہی حرف آیا ہے۔ منفرد یا اکیلے استعمال ہونے والے حروف قاف (ق)، نون (ن) اور صاد (ص) ہیں۔

ق

حروف مقطعات میں سے سب سے پہلے حرف قاف (ق) کے اسرار سے پردہ اٹھایا جاتا ہے۔ حرف قاف جس سے لفظ قرآن بنتا ہے۔ یہ حرف صرف دو سورتوں کے آغاز میں آیا ہے۔

(1) سورت قٓ:- جو اسی حرف قٓ سے شروع ہوتی ہے۔

(2) سورت الشوریٰ:- جو حٰمٓ۔ عٓسٓقٓ سے شروع ہوتی ہے۔

اب ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ آپ خود ان دونوں سورتوں میں حرف "ق" کی گنتی کریں۔ آپ دیکھیں گے کہ:-

سورت قٓ میں حرف قاف کی تعداد 57 ہے جو 19 پر تقسیم ہو جاتا ہے۔ (3x19=57)

سورت الشوریٰ میں بھی حرف قاف کی تعداد 57 ہے جو 19 پر تقسیم ہو جاتا ہے۔

حیران کن بات یہ ہے کہ سورت الشوریٰ طوالت میں سورت قٓ سے تقریباً اڑھائی گنا بڑی ہے۔ اس کے باوجود بھی دونوں سورتوں میں حرف قاف کی تعداد برابر ہے۔ حرف قاف بس ان

دوسورتوں کے آغاز میں آیا ہے۔ اگر ہم حرف قاف کو لفظ قرآن کی علامت یا اختصار تصور کریں تو ان دونوں سورتوں میں آنے والے حرف قاف کا مجموعہ (57+57) 114 بنتا ہے جو کہ قرآن کریم کی کل سورتوں کی تعداد کا تعین کردیتا ہے، یعنی یہ قرآن کے اندر سے ظاہر ہونے والی ایک معجزاتی شہادت ہے کہ قرآن حکیم کی کل سورتیں 114 ہی ہیں اور یہ مکمل قرآن اپنی اصل صورت میں قائم ہے، سورت قٓ کی پہلی آیت قٓ والقرانِ المجید o بھی اسی طرف اشارہ کرتی معلوم ہوتی ہے کہ قٓ سے مراد قرآن مجید ہی ہے۔ واللہ اعلم

ن

حرف نون صرف سورت القلم کے آغاز میں اکیلا ہی آیا ہے، اگر آپ اس سورت میں حرف نون (ن) کا شمار کریں تو آپ اسے 133 مرتبہ لکھا ہوا پائیں گے۔ یہ عدد بھی انیس پر تسیم ہو جاتا ہے۔ (7x19=133)

ص

یہ حرف تین سورتوں کے آغاز میں آیا ہے اور ان میں حرف صاد (ص) کی تعداد اسطرح ہے۔

1- الاعراف (7) = الٓمّٓصٓ سے شروع ہوتی ہے اور اس میں حرف صاد کی تعداد 98 ہے۔

2- الریم (19) = کٓھٰیٰعٓصٓ سے شروع ہوتی ہے اور اس میں حرف صاد کی تعداد 26 ہے۔

3- ص (38) = صٓ سے شروع ہوتی ہے اور اس میں حرف صاد کی تعداد 28 ہے۔

ان تینوں سورتوں میں آنے والے صاد کی تعداد کو جمع کر کے دیکھیں (98+26+28) تو حاصل جمع 152 آئے گا جو 19 پر تقسیم ہو جاتا ہے۔ (8x19=152)

مقصد تخلیق آدم

(عبدالرشید ساہی)

محترم سامعین میں نے جون 2003ء کے شمارے میں مندرجہ بالا عنوان سے ایک مضمون پیش کیا تھا اس کا بقیہ حصہ لکھ رہا ہوں۔ میں عرض کر رہا تھا کہ جب رضائے الٰہی مقصد حیات بن کر انسان کی پوری زندگی پر محیط ہو جائے تو اس کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، سونا جاگنا، چلنا پھرنا الغرض سارا کاروبار حیات ہی عبادت اور بندگی قرار پاتا ہے اس کا ایک ایک سانس اور ایک ایک لمحہ عبادت میں شمار ہوتا ہے۔

روبرو ایک خوبرو ہے میں نہیں — اس کا جلوہ چار سو ہے میں نہیں

درد میں دل میں جگر میں سوز میں — اس کا چرچا کو بکو ہے میں نہیں

مقصد من میں اتر جائے تو بندہ مقصود خلاق بن جاتا ہے جس انسان کی زندگی کا ہر لمحہ خدا کی یاد اور اس کی رضا کے لئے وقف ہو اس شخص کو دیکھنا بھی خود یاد الٰہی بن جاتا ہے علامہ فرماتے ہیں:-

سراپا حسن بن جاتا ہے جس کے حسن کا عاشق

بھلا اے دل حسیں ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں

جیسا کہ نبی مکرمؐ نے ارشاد فرمایا "کیا میں تمہیں ان لوگوں کے بارے میں نہ بتاؤں جو تم میں سے افضل ہیں صحابہؓ نے عرض کیا جی ہاں یارسول اللہؐ تو حضور اکرمؐ نے فرمایا:- تم میں سے افضل وہ لوگ ہیں جنہیں دیکھتے ہی خدا یاد آ جائے رضائے حق کو اپنا مقصود حقیقی سمجھنے والے جب اس مقصود کو عملاً پا لیتے ہیں ان پر یہ شعبہ صادق آ جاتا ہے شعر عرض ہے۔

یہ نہیں مجھ کو خبر کیا ہے حقیقت کیا مجاز؟

دیکھ کر ان کو خدا کو یاد کر لیتا ہوں میں

جو انسان بھی رب العزت کے دیئے ہوئے آئین کی مکمل پاسداری کرتا ہے وہ خود بھی خدا کا محبوب مرتضٰی بن جاتا ہے خود رب کریم انہیں اپنا مطلوب و مقصود بنا لیتا ہے قرآن کریم اس کی تائید یوں کرتا ہے **"قل ان کنتم تحبون الله اتبعون یحببکم الله"** فرما دیجئے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری غلامی اختیار کرو اللہ تمہیں اپنا محبوب بنا لے گا اس آیت

میں صداقت کے ساتھ یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ رضائے الٰہی کی طلب اطاعت واتباع رسول ہاشمیؐ کے بعد انسان کو خود محبوب مرتضٰی بنا دیتی ہے انسان کی جہد حیات کا آغاز تو حب الٰہی اور رضائے الٰہی کے اصول کی کاوش سے ہوتی جس میں صداقت کی شرط اتباع رسول ہاشمیؐ ہے ورنہ حب الٰہی اور رضائے الٰہی کا دعویٰ کامل تصور نہیں ہوسکتا لیکن اتباع رسول اللہؐ جس کا محرک محبت ہو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بندہ محبّ سے محبوب، طالب سے مطلوب، اور متلاشی رضا سے خود مرتضٰی و مجتبٰی بن جاتا ہے وہ "عبد محض" کی بجائے عبدہ ہو جاتا ہے۔

اس تصور کو علامہ اقبال یوں بیان کرتے ہیں:-

عبد دیگر عبدہ چیزے دگر
ایں سراپا انتظار و منتظر

قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا:

ترجمہ!"اللہ تعالیٰ اپنی ذات تک رسائی دے دیتے ہیں جیسے چاہیں اپنی طرف راہ دکھا دیتے ہیں جو کوئی ارادہ کرے"

یہ عنایات الٰہیہ ہیں جس پر کسی کا بھی قبضہ وتصرف نہیں وہ ذات جس کو جس قدر چاہے نواز دے لہٰذا جب بندہ رضائے الٰہی کے نصب العین اور مقصود کو پالے اس کو خود مقصود خلاق بنا دیا جاتا ہے جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ نبی اکرمؐ سے روایت کرتے ہیں۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا:- جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے محبت کرتے ہیں تو جبریل کو نگاہ کر کے فرماتے ہیں میں نے فلاں شخص کو محبوب مرتضٰی بنا لیا ہے تو بھی اس سے محبت کر لے جبریل اس کو محبوب بنا لیتا ہے اور آسمانوں میں ندا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں شخص کو اپنا محبوب بنا لیا ہے تم بھی اس سے محبت کرو، اہل سماء بھی اس کو محبوب بنا لیتے ہیں پھر اس شخص کے لئے اہل زمین کے دلوں میں مقبولیت اتار دی جاتی ہے یعنی اہل زمین بھی حکم الٰہی سے اسے اپنا محبوب ومقصود بنا لیتے ہیں۔

جن لوگوں نے رضائے الٰہی کو مقصود حیات بنا کر اپنے صبح وشام اسی رنگ میں ڈھال لئے ہیں قرآن ان سے بھی خصوصی لگاؤ اور تعلق قائم رکھنے کی تلقین کرتا ہے اس لئے کہ ان کی محبت و معصیت سے اور کچھ نہ سہی محبوب کی خبر تو ملتی رہتی ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی سورۃ الکہف آیت نمبر 28 میں ارشاد فرمایا ہے "اپنی طبیعت ان لوگوں سے مانوس رکھو جو صبح وشام اپنے رب کو

پکارتے اور اس کی رضا چاہتے ہیں کہ تم ہر وقت ان سے اس طرح قریب رہو کہ تمہاری آنکھ ان سے ہٹ کر کہیں اور پھرنے نہ پائے" اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ربانی ہے "**یا یہا الذین اٰمنو اتقوالله وکونو مع الصدقین**" اے اہل ایمان اللہ سے ڈرو اور صدق والوں کی صحبت اختیار کرو" یقیناً صدق والے ہی لوگ ہیں جو خلوص دل سے رضائے الٰہی کے طلبگار ہیں اور جنہیں نعمت رضوان نصیب ہو چکی ہے میں نے جو بیان کیا ہے اس کے مطابق تمام آیات واحادیث میں مختلف صورتوں سے ایک ہی حقیقت پر زور دیا گیا ہے اور وہ ہے اہل رضا سے واسطہ اور تعلق معصیت اور وابستگی اختیار کرنا کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے مقصود زندگی کو پا چکے ہیں لہٰذا مقصد حیات اور نصب العین کی صحیح ہدایت بھی ان ہی کے رستہ سے میسر آ سکتی ہے یہ لوگ چونکہ صحیح معنوں میں ہدایت یافتہ ہیں اس لئے ہدایت کا اولین شعور بھی ان ہی کے رستہ سے نصیب ہوتا ہے علامہ فرماتے ہیں:-

کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمن دل کو
کہ خورشید قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں

قرآن حکیم اس حقیقت کی تائید ان الفاظ میں کرتا ہے سورۃ المائدہ آیت نمبر 16-10

"بیشک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور آیا اور ایک روشن کتاب اس سے اللہ اسی کو سلامتی کے رستوں کی ہدایت دیتا ہے جس نے اس کی رضا کو اپنا لیا اور وہ انہیں اپنے حکم سے اندھیروں سے نکال کر روشنی یعنی صحیح شعور کے اجالے کی طرف لے جاتا ہے اور وہ انہیں سیدھی یعنی استقامت والی راہ دکھاتا ہے"

ان آیات نے تذکرہ و بحث کے نتیجہ پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ جو لوگ رضائے الٰہی کے نصب العین کے طلبگار ہیں حقیقت میں وہی راہ ہدایت پر ہیں اور انہی کے سینے شعور مقصدیت کے اجالوں سے منور ہیں انہی کی راہ راہ مستقیم ہے اور انہی کو منزل تک رسائی کی ختمی ضمانت نصیب ہو چکی ہے۔

آپ بھی دو چار قطرے پی کے میرے جام
اہل دل اہل وفا اہل نظر ہو جائیے

اس لئے باری تعالیٰ نے **اھدنا الصراط المستقیم o** کے الفاظ کے فوراً بعد اس

دعا اور التجا کو نتیجہ خیز کرنے کے لئے **صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم والاالضالین ہ** کے ذریعہ رستہ کا تعین فرما دیا تا کہ انسان کی زبان سے نکلی ہوئی دعا اس معنی و مفہوم کا جامع پہن کر بارگاہ الوہیت میں پہنچے کہ اے باری تعالیٰ ہم کو اس مقصد حیات کا شعور عطا کر جس سے تونے اپنے انعام یافتہ بندوں کو نوازا۔ اے باری تعالیٰ ہم کو اپنے نصب العین کے حصول کے لئے اسی راستے پر چلا جس پر تیرے انعام یافتہ بندے چلتے رہے اے باری تعالیٰ ہم کو منزل مقصود تک رسائی کی ضمانت اس طرح عطا کر جس طرح تو نے اپنے انعام یافتہ بندوں کو عطا فرمائی اور ذات حق کے انعام یافتہ بندے جن کا رستہ صراط مستقیم قرار پا چکا ہے وہی ہیں جن کا ذکر سورۃ المائدہ کی آیت نمبر 12 میں ان الفاظ کے ذریعے کیا گیا ہے۔ ترجمہ! اللہ تعالیٰ نور ہدایت اور صراط مستقیم سے ان ہی لوگوں کو نوازتے ہیں جو رضائے الٰہی کو اپنا نصب العین بنا کر اپنی زندگی اس کے لئے وقف کر چکے ہیں۔ جو الفاظ بیان کئے گئے ہیں ان سے، یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ انسان کی انفرادی زندگی کا مقصد اور نصب العین صرف اور صرف اخلاقی کمال کا حصول ہے جس کی اعلیٰ ترین صورت رضائے الٰہی ہے اس نعمت گراں مایہ کے حصول کا ذریعہ جو کہ آسان بھی ہے اور سادہ بھی وہ صحبت حق اختیار کرنا ہے انعام یافتہ انسانوں کی محبت سے بدکردار اور بدقماش لوگ متقی اور پارسا بن گئے حیوان صفت بھی انسانیت کے علمبردار بن گئے علامہ اقبال فرماتے ہیں:-

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آداب فرزندی

اس قسم کی بے مثال مثالوں سے تاریخ اسلام بھری پڑی ہے جس طرح نگاہ نبوت سے فیض ملتا ہے اس طرح نگاہ ولایت سے بھی فیض ملتا ہے۔ جن انسانوں کی زبان میں رب العزت بولتے ہیں وہ رب کریم کے فضل و عنایت سے ضرور اپنا اثر دکھاتی ہے اسی وجہ سے برے انسان برائیوں سے تائب ہو کر اسلام کی حقیقی زندگی کو اپنا لیتے ہیں اور اپنی زندگی کو اللہ اور رسول اللہؐ کے رنگ میں رنگ لیتے ہیں جب وہ اللہ سے راضی ہو جاتے ہیں تو ستر 70 ماؤں سے زیادہ محبت کرنے والا رب ان کو اپنی آغوش رحمت میں لے لیتا ہے اور ان کی تقدیر یکسر بدل جاتی ہے۔

ہو جن کا عشق صادق وہ سمندر چیر جاتے ہیں

ماضی میں علمائے کرام کا کردار

(اور جدید دور میں ان کی ذمہ داریاں)

(محمد موسیٰ بھٹو)

(آخری حصہ)

اس سلسلہ میں مولانا حالی "حیات جاوید" میں لکھتے ہیں۔ ہندوستان میں اسلام خطرے میں گھڑا ہوا تھا۔ ایک طرف مشنری گھات میں لگے ہوئے تھے، ہندوستان میں سب سے زیادہ دانت ان کا مسلمانوں پر تھا۔ ان کی منادیوں میں، ان کی اخباروں اور رسالوں میں زیادہ تر بوچھاڑ اسلام پر ہوتی تھی۔ اسلامی تعلیم کی طرح طرح سے برائیاں ظاہر کرتے تھے، داعی اسلام کے اخلاق و عادات پر انواع واقسال کی نکتہ چینیاں کرتے تھے۔ چنانچہ بہت سے مسلمان کچھ ناواقفیت اور بے علمی کے سبب اور اکثر افلاس کے سبب ان کے دام میں آ گئے۔ اس خطرے میں بلاشبہ علماء اسلام جیسے مولانا آل حسن، مولانا رحمت اللہ مرحوم اور ڈاکٹر وزیر خان وغیرہ متنبہ ہوئے اور انہوں نے متعدد کتابیں عیسائیت کے رد میں لکھیں اور ان سے بالمشافہ مناظرے کئے جس سے یقیناً مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچا۔

علماء کرام نے پادریوں کے لٹریچر کے جواب میں ۱۳۰۸ء تک ۲۱۱ کتابیں لکھیں جو لاکھوں کی تعداد میں شائع کر کے تقسیم کی گئیں۔ اسی طرح ۶۲ رسالے شائع کیے۔

علماء کرام کی متعدد کتابیں عربی اور انگریزی میں بھی شائع ہوئیں۔ ان کتابوں میں پادریوں کے دلائل کا اس انداز سے پوسٹ مارٹم کیا گیا تھا کہ اس وقت کے اخبار "ٹائمز آف انڈیا" نے امام فن مولانا رحمتہ اللہ کی کتاب اظہار الحق (کے انگریزی ترجمے) کے بارے میں لکھا کہ لوگ جب تک اس کتاب کو پڑھتے رہیں گے تب تک مذہب عیسائیت کی ترقی رک جائے گی۔

عیسائی پادری مناظروں کے لئے بڑی زبردست تیاریاں کر کے آتے تھے لیکن علمائے اسلام کی تیاریاں بھی کم نہ ہوتی تھیں۔ چنانچہ مناظرہ بازی کے سینکڑوں پروگرام ہوئے۔ سب میں عیسائی پادریوں کو لاجواب ہونا پڑا۔ ایک پادری برکت اللہ اپنی کتاب میں آگرے کے تاریخی مناظرے کا ذکر کرتے ہوئے تعلّی کے ساتھ لکھتا ہے:

" یہاں کے علمائے کرام دہلی کے علماء کے ساتھ گذشتہ دو تین سال سے کتاب مقدس اور

ہماری کتابوں کا اور مغربی علماء کی تنقیدی کتب اور تفاسیر کا مطالعہ کر رہے تھے تا کہ وہ کتاب مقدس کو غلط اور باطل ٹھہرا سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی کے عالم مولوی رحمت اللہ نے دو کتابیں تصفیف کیں۔ جنوری ۱۸۵۴ء میں جب میں یہاں نہیں تھا وہ آگرہ میں آیا تھا کہ اپنے احباب کے ساتھ ان کتب کو چھپوانے کا انتظام کرے اور مناظرہ کرے۔ مناظرہ ہوا، پہلے روز تقریباً ایک سو مسلمان علماء مولوی رحمت اللہ کی مدد کے لئے جمع تھے۔ دوسرے روز مسلمان علماء کی تعداد دگنی تھی۔ مناظروں میں شکست کھانے کے بعد پادریوں نے خود ہی اس سلسلہ کو بند کر دیا۔

یہ ساری تفصیلات اس لئے بیان کی گئیں تا کہ معلوم ہو سکے کہ برصغیر ہند کے مسلمان جب اجتماعی طور پر دینی اور تہذیبی اعتبار سے سب سے بڑے فتنہ سے دو چار تھے تو اس وقت یہ علمائے کرام ہی تھے جنہوں نے اس فتنہ کا جرات، بصیرت، خود اعتمادی اور صلاحیت کے ساتھ مقابلہ کیا یہ ان کی وقت کے تقاضوں کو سمجھنے اور بیدار مغز ہونے کی نشانی تھی۔

اب یقیناً یہ سوال پیدا ہوگا کہ ماضی میں جب علمائے کرام نے مسلم معاشرہ کو درپیش خطرات سے بچانے اور ان کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو پار کرنے کے لئے مثالی کردار ادا کیا تھا تو بعد میں وہ ایسا کیوں نہ کر سکے۔ اس سوال کو یوں بھی لیا جا سکتا ہے کہ بالخصوص قیام پاکستان کے بعد ہمارے علمائے کرام ملک کی اسلامی خطوط پر تعمیر، اصلاح معاشرہ اور شریعت سے عمومی انحراف کی روک تھام کے سلسلہ میں موثر کردار کیوں ادا نہ کر سکے اور اسلاف کے تسلسل کو برقرار و قائم رکھنے میں کیوں نا کام رہے یہ بہت اہم اور بنیادی نوعیت کا سوال ہے ہمیں اس سوال پر تفصیل سے غور کرنا چاہیے۔

اس سوال کا ایک جواب تو یہ ہے کہ انگریز نے ہمارے ہاں جس نظام تعلیم کی بنیاد رکھی تھی اس میں علماء و قرآن حدیث پر مشتمل دینی درسگاہوں کی کوئی گنجائش نہیں تھی، چونکہ پاکستان میں انگریزی معنوی اولاد اور تہذیب جدید کے علمبرداروں کی حکومت رہی اور انہوں نے اپنا اور اپنی اولاد کا مستقبل اسی نظام تعلیم کو زندہ رکھنے میں محفوظ سمجھا اس لئے یہاں حکومتی سطح پر نہ صرف یہ کہ علماء کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی گئی بلکہ ان کو اپنے لئے خطرہ سمجھا گیا۔ حکومت کے اس رویے نے بھی علماء کو غیر موثر اور ان کی صلا ں کو مفلوج بنا کر رکھ دیا۔ اس سوال کا یہ جواب ایک حد تک یقیناً صحیح ہے لیکن معاشرہ کو کچھ نہ دے سکنے میں علماء کی اپنی داخلی کمزوریوں کا بھی تعلق ہے۔ جسے

نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

علماء کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ عملی طور پر لکیر کے فقیر بن کر رہ گئے ہیں۔ ان کے نصاب تعلیم میں جدید حالات اور تہذیب جدید کے پیدا کردہ مسائل سے عہدہ برآ ہونے اور وقت کے چیلنج کا مقابلہ کرنے اور مجتہدانہ صلا ں کے حامل علماء پیدا کرنے کا کوئی انتظام نہیں۔ ملا نظام الدین نے اپنے دور کے تقاضوں کے تحت جو کتابیں نصاب تعلیم میں داخل کی تھیں مدارس میں آج تک جزوی تبدیلی کے ساتھ وہی کتابیں شامل ہیں۔ اس نصاب کا ایک کمزور پہلو یہ ہے کہ اس میں قدیم منطق، قدیم فلسفہ اور قدیم ریاضی کی کتابوں کا (جواز کار رفتہ ہو چکی ہیں) بڑا حصہ موجود ہے۔ ابتداء سے آخر تک اس طرح کی کتابوں کی بھرمار ہے، لیکن تاریخ اسلام، مذاہب کا تقابلی مطالعہ، جدید سیاسی و معاشی نظریات، قرآن اور تفسیر قرآن کا کوئی اہتمام وانتظام نہیں۔ درسگاہوں کے نظام میں دوسرا نقص یہ ہے کہ اب تک اس کی تعلیمی سرگرمیاں انفرادی مذہب سکھانے تک محدود ہیں۔ چند عقائد اور ان کے متعلق کلامی بحثیں، بنیادی عبادات اور ان سے متعلق فقہی مسائل، فرقوں کے اعتقادی و فقہی نظام کے مناظرانہ ومجادلانہ طریق فکر یہ اور اس طرح کی دیگر چیزوں پر ہمارے دینی مدارس کا نظام تعلیم مشتمل ہے ہمارا یہ دینی نظام تعلیم دس بارہ سال کی محنت کے باوجود ایسے افراد تیار کر کے نہیں دیتا جو زندگی اور تمدن کے وسیع نظریات و مسائل پر ماہرانہ رائے دے سکیں، جن کے پاس اعلیٰ درجے کے عقلی معیار موجود ہوں جو اسلام کو جدید اسلوب میں پیش کر سکیں۔ ایک ممتاز دینی عالم نے مدارس کے موجودہ نصاب تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے دردمندی کے ساتھ بہت عمدہ باتیں کہیں تھیں وہ لکھتا ہے "ابتداء سے لے کر اب تک ہر زمانے کی ضرورت کے موافق مدرسہ کا نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم بدلتا آیا ہے آج بھی ضرورت ہے کہ اسے بدلا جائے لیکن یہ آواز نہ سننے کا نتیجہ ہے کہ سینکڑوں دینی مدارس کے ہوتے ہوئے قوم کی مذہبی ضرورتیں رفع نہیں ہوتیں آج قوم کی ضرورتیں یہ ہیں۔

ا۔ موجودہ فلسفہ سے اسلام پر جو اعتراضات وارد ہوتے رہتے ہیں ان کا جواب دیا جائے۔

۲۔ مخالفین، اسلام پر جو اعتراضات کرتے ہیں ان سے واقف ہوا جائے۔

۳۔ اسلامی علوم وفنون یعنی تفسیر، حدیث، اصول، فقہ اور ادب کا ماہر ہونا۔

۴۔ نئے مذاق کے مطابق واعظین اور مقررین کا موجود ہونا۔

بزرگان سلف نے ہر زمانہ میں مدرسہ کے نصاب میں تبدیلیاں کیں۔ کتابوں کا انتخاب، علوم درسیہ کا تعین، تعلیم کا طریقہ یہ چیزیں ہمیشہ بدلتی رہی ہیں بنی امیہ کے دور تک کتابی درس کا مطلق رواج نہیں تھا بلکہ استاد زبانی تقریر کرتا تھا اور طلبہ اس کو قلمبند کرتے جاتے تھے۔ یہ طریقہ حکومت عباسیوں میں بھی مدتوں جاری رہا۔ اس کے بعد کتابوں کا درس شروع ہوا۔

فارابی کے زمانے تک یعقوب کندی کی تصنیفات درس معقولات میں داخل تھیں اس کے بعد بوعلی سینا کی کتابیں مقبول ہوئیں اور قدیم کتابیں گمنامی کے گوشہ میں داخل ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ ملا نظام الدین کا عہد آیا اور قدیم نظام کی بالکل کایا پلٹ گئی۔ موجودہ نصاب ملا صاحب کی طرف منسوب ہے۔ اسی وجہ سے نظامیہ کہلاتا ہے لیکن بعض کتابیں مثلاً ملا حسن، غلام یحییٰ، حمد اللہ، قاضی آہستہ آہستہ بعد میں داخل ہوتی گئیں۔

جب ماضی میں مختلف ضرورتوں کے تحت دینی مدارس کے نصاب اور طریقہ تعلیم میں تبدیلی ہوتی رہی ہے تو آخر موجودہ دور میں (جبکہ تبدیلی نصاب کی سب سے زیادہ ضرورت ہے) اس طرف کیوں توجہ نہیں دی گئی؟ غالباً اس کا بڑا سبب اسلاف کے ساتھ بے پناہ محبت وعقیدت اور ان کے تقدس علمی عظمت کے سامنے اپنے عجز و بے بضاعتی کا احساس واعتراف ہے۔ اس میں بزرگوں کے نصاب کو متبرک کے طور پر زندہ رکھنے کا جذبہ بھی شامل ہے، یقیناً اسلاف سے عقیدت قابل قدر چیز ہے لیکن اسلاف سے عقیدت کا مطلب ان کے علمی کمالات کو جوں کے توں قائم و برقرار رکھنا نہیں بلکہ ان سے استفادہ کر کے ان میں ہر دور کے تقاضوں کے مطابق اضافہ کرنا اور ان کی بنیادی روح کو سمجھنا ہے اس کے ساتھ ساتھ اسلاف کے زندہ رکھنے کی چیزیں سادگی، قناعت اور استغنیٰ کی صفات ہیں جو ان کی زندگی کا جوہر اور حاصل تھا اور جن کو زندہ رکھنے اور اپنانے سے ان کی روحوں کو مسرت بھی حاصل ہوگی کسی نظام یا نصاب کو محض روایت پرستی کے ساتھ باقی نہیں رکھا جا سکتا۔ کسی صالح سے صالح نظام کو بھی محض روایت پرستی، ایک مقدس ورثہ اور آثار قدیمہ کے طور پر باقی نہیں رکھا جا سکتا۔

یہ زندگی رواں دواں اور حقیقت پسند زندگی ہے، جو چیز جدید ضرورتوں اور تیز رفتار حالات کا ساتھ نہیں دے سکتی وہ یا تو اپنی افادیت کھودیگی یا اس کی حیثیت بے جان اور مردہ کی سی ہوگی۔

"قرآن مجید کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس کائنات میں خدا کا قانون بقائے انفع کا قانون ہے۔

سورۃ رعد کی سولہویں آیت میں ہے "**فاما الذبد فیذھب جفاءً واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض کذالک یضرب اللہ الامثال**" جس چیز میں کوئی پیغام نہیں ہے، جو چیز کوئی اہم خدمت انجام نہیں دے رہی ہے، جس پر انسان کی بقاء اور نشو ونما اور انسان کی راحت اور ترقی کا کوئی انحصار نہیں ہے۔ قرآن مجید نے اس کو زبد کے لفظ سے ادا کیا، جو بہت ہی جامع اور نہایت وسیع اور عمیق لفظ ہے اور معانی سے لبریز ہے۔ زبد جھاگ کو کہتے ہیں، یعنی دریا کا وہ جھاگ جو اپنے اندر کوئی ہستی نہیں رکھتا وہ دریا کے جوش کی ایک نمود ہے۔ اس کے اندر کوئی استقرار اور کوئی صلابت نہیں ہے بس ایک پھولی ہوئی چیز ہے جس کے اندر ہوا بھر گئی ہے اس لئے اس میں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا جو قانون تربیت ہے وہ اس کی اجازت نہیں دیتا کہ زبد زیادہ دنوں تک باقی رہے۔ **واما ما ینفع الناس** لیکن جو چیز لوگوں کو نفع پہنچانے والی ہے **فیمکث فی الارض** وہ ٹھہر جاتی ہے۔

بہر حال دینی مدارس کے اس نظام اور ان کے نصاب تعلیم کی اس کمزوری کا نتیجہ ہے کہ ہمارے علمائے کرام اکثر جدید فنون اور ان کی حقیقت و ماہیت کے پس منظر اور ان کے محرکات وعوامل اور ان کے ارتقاء کی تاریخ سے ناآشنا رہتے ہیں۔ مقابلہ کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ حریف اور مدمقابل کی طاقت اور اس کے مقاصد سے واقفیت ہو۔

جدید دور کا سب سے بڑا چیلنج وہ نت نئے مسائل ہیں جو تہذیبی، معاشرتی، سیاسی، معاشی اور عقائد کے میدان میں مغربی تہذیب اور معاشرت نے پیدا کئے ہیں نیز تاریخ و ادب اور سوشیالوجی ہے۔ ان ہتھیاروں سے لاکھوں کروڑوں افراد کو مذہب بیزاری، الحاد و تشکک، مرعوبیت اور ذہنی انتشار کا مریض بنایا جارہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا مقابلہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ہمارا طبقہ علماء اپنی سوچ میں وسعت اور بلندی پیدا نہیں کرے گا اور جدید علوم کے اسلحہ خانے سے مسلح ہو کر نہیں تو کم از کم تعارف و واقفیت حاصل کر کے بے خدا تہذیب کے علمبرداروں کا مقابلہ نہیں کرے گا۔

اس وقت زمانہ کو ایسے مردان کار کی ضرورت ہے جو اس نئے دور کو نئی فکری قیادت، ایک نیا دینی اعتماد اور ایک نئی روحانی واخلاقی قوت عطا کر سکیں یہ قیادت اگر علماء نہ دے سکے تو جدید طبقہ سے تو یہ ضرور حاصل ہو گی اس لئے کہ خال زیادہ عرصے تک نہیں رہتا اسے بہر صورت پر ہونا ہے

لیکن اس سعادت سے دینی مدارس کے علماء وفضلا محروم رہیں گے اور یہ محرومی بہت بڑی بدنصیبی کی بات ہے۔

ہمارے علماء کی دوسری کمزوری جوزیادہ تر انہیں مدارس سے ورثہ میں ملی ہے یہ ہے کہ وہ اپنے جداگانہ فقہی مسلکوں اور فرقوں کی سوچ سے بلند نہ ہو سکے۔ ہماری مذہبی زندگی میں مسلک کے دبستان فکر نے وہ حیثیت اختیار کرلی ہے کہ ہمارے علماء کا زیادہ تر وقت اسی میں صرف ہونے لگتا ہے اور آپس کے اختلافات اور تنازعات الگ پروان چڑھتے ہیں۔ حالانکہ مختلف فرقوں کا علیحدہ وجود برقرار رکھتے ہوئے قرآن وسنت کی بنیاد پر امت کے اندر اخوت ومحبت کے جذبات پیدا کئے جا سکتے ہیں اگر علماء کرام اپنے طرز عمل سے یہ نمونہ پیش کریں کہ اسلامی رشتہ ہی اولین اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ فقہی اور فرقوں کے اختلافات ثانوی اہمیت کے حامل ہیں تو اس سے مسلمانوں میں ملت واحدہ کے تصور کو فروغ حاصل ہوگا اور طبقوں میں بٹ جانے پھر مخالف مسلک کے حامل کو قابل گردن زنی تصور کرنے کی ریت کا خاتمہ ہوگا خوش قسمتی سے علماء کے پاس مساجد موجود ہیں۔ جمعہ کی تقاریب اور دیگر تقریبات کے ذریعہ وہ ملک میں وسیع دینی ومذہبی ذہن پیدا کر سکتے ہیں۔

مذہبی طبقہ کی خدمت میں یہ گذارشات دردِ دل کے ساتھ پیش کی گئی ہیں اور ان کا مقصد جذبہ اصلاح کے سوا کچھ نہیں۔ میرے نزدیک مدارس کا قدیم نظام اب بڑی حد تک اپنی افادیت کھو چکا ہے۔ اسی لئے اب اس میں ممتاز علماء وفضلاء اور ماہرین اسلامی قانون پیدا ہونا ناپید ہو گئے ہیں۔ دینی مدارس کے فضلاء کا مقام مسجد کی پیش امامی ہی نہیں بلکہ زندگی کے علمی وعملی مسائل کا حل اور معاشرے کی رہنمائی اور قیادت کرنا بھی ہے۔ اگر اس سلسلہ میں علماء کی سوچ اور مدارس کے ذمہ داروں کے طرز فکر میں بنیادی تبدیلی نہیں ہوئی تو شاید ہمارا بہت سا قیمتی ورثہ زمانہ کے بے رحم ہاتھ کا شکار ہو جائے۔ خدا کرے ایسا نہ ہو۔

دین اور آئیڈیالوجی

(کے۔ ایم اعظم)

آئیڈیالوجی (نظریہ) ان خیالات اور تصورات کا مجموعہ ہوتی ہے جو کسی قوم یا معاشرہ کے بیچ مشترک ہوتے ہیں۔ آئیڈیالوجی ایک طرف تو سماجی اور معاشرتی حقیقتوں کی عکاسی کرتی ہے اور دوسری طرف قوم اور معاشرہ کے لئے پسندیدہ اقدار اور اہداف کا تعین کرتی ہے۔ کسی بھی معاشرہ کے بیچ حقیقت، آئیڈیالوجی، معاشرتی اور اقتصادی اداروں کے درمیان ایک مسلسل تعامل اور تفاعل ہوتا رہتا ہے۔ بہر حال نظریات آسمان سے نہیں اترتے بلکہ اپنے مخصوص تاریخی پس منظر میں وقت کے ماحول اور ضروریات کے مطابق رونپذیر ہوتے رہتے ہیں۔ نظریات کسی ایک مقام پر جامد بھی نہیں رہتے بلکہ بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر ان میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ ایسی آئیڈیالوجی، جس میں کوئی لچک نہ ہو عطریہ (Dogma) ہوتی ہے۔ عموماً دیرپا نظریات لچکدار اور مطابقت پذیر ہوتے ہیں اور اس طرح کسی حد تک غیر معین و مبہم ہوتے ہیں۔

آئیڈیالوجی چونکہ انسانوں کی معین کی ہوئی ایک شے ہوتی ہے اس لئے اسے اللہ کے متعین کئے ہوئے ابدی اصولوں کے ساتھ گڈمڈ نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا کرنے سے ایک طرف تو آئیڈیالوجی کنفیوژن اور تذبذب کا شکار ہو جاتی ہے تو دوسری طرف دین کی ابدی عفت ملوث ہو جاتی ہے۔ مگر اس قضیہ کے باوجود انیسویں اور بیسویں صدیوں کے سنگم پر برصغیر ہندو پاکستان میں آئیڈیالوجی اور دین بے ڈھنگے طریقے سے آپس میں خلط ملط کر دیئے گئے۔

انیسویں اور بیسویں صدیوں کے دوران یورپ میں دو نہایت ہی دوررس واقعات ظہور پذیر ہوئے۔ انیسویں صدی میں یورپ بالخصوص برطانیہ، ایک عظیم استعماری قوت کے طور پر جلوہ گر ہوا، جبکہ بیسویں صدی میں دنیا نے آئیڈیالوجی کی بے پناہ طاقت کا مظاہرہ دیکھا، جس کے تحت فاشزم نے اٹلی اور سپین میں، نازی ازم نے جرمنی میں اور مارکسزم نے روس میں پرزور غلبہ حاصل کرلیا۔ وقت کے اس سنگم پر ہندوستانی مسلمان معاشرتی مصلحین اور دینی اکابرین ایک طرف برطانیہ کی بڑھتی ہوئی عسکری قوت اور صنعتی ترقی اور دوسری طرف آئیڈیالوجی کی طوفانی قوت سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔

یہ مسلمان زعما اس وقت ایک ایسے طریق کار کی تلاش میں سرگرداں تھے کہ جس کو اپنا کر وہ اپنی عظمت رفتہ کو دوبارہ حاصل کر لیں۔ اس سلسلے میں قدرتی طور پر انہیں اپنے اضمحلال و انحطاط کا حل مغرب کے طور طریقوں میں نظر آیا۔ مگر ان کی توجہ اس قضیہ کے فطری تضاد کی طرف مبذول نہ ہوئی۔ بے شک ہمارے دینی عمائدین اپنی اسلامی عظمت کو ہی دوبارہ حاصل کرنا چاہتے تھے، وہ بطور کسی نئی سیکولر طاقت کے تو ابھرنا نہیں چاہتے تھے۔ یہی ان کی ایک مہلک فکری غلط فہمی تھی۔ حیرانی ہے کہ یہ فکری تناقص اتنی دیر ان کی نظروں سے اوجھل رہا۔ حقیقت یہ تھی کہ اگر وہ مغربی اطوار پر ترقی پذیر ہونا چاہتے تھے تو انہیں اسلامی سیاسی و معاشی نظام کو پس پشت ڈال کر مغرب کے لادینی مسلک کو کلی طور پر اپنا لینا چاہیے تھا۔ ان کو اس بات کا احساس بالکل نہ ہوا کہ مغرب کے لادینی تصورات کا اسلامی نظام حیات کے ساتھ کسی بھی قسم کا امتزاج ناممکن ہے۔

اس کے بعد ہمارے دینی اکابرین یورپ کی نظریاتی جماعتوں کی ڈرامائی کامیابی سے مسحور ہو کر رہ گئے۔ کوئی بھی دینی راہنما ایسا نہ بچا جو آئیڈیالوجی کے حسن کرشمہ ساز سے متاثر نہ ہوا ہو۔ ان کی نظروں میں یورپ کا نظریاتی سیاسی ماڈل اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے بہت موزوں تھا، کیونکہ اس ماڈل کے تحت یورپی نظریاتی سیاسی جماعتوں کے بامقصد، متحرک اور منظم کارکنوں کی ایک قلیل تعداد نے بڑے بڑے ملکوں اور بڑی بڑی آبادیوں پر تھوڑے سے عرصہ میں مکمل تسلط قائم کر لیا تھا۔ ہمارے دینی زعما کو اس بات کا احساس تھا کہ پوری مسلمان قوم کی اصلاح ناممکنات میں سے ہے۔ اس لئے وہ یورپی نظریاتی سیاسی ماڈل کے نقوش پر مومنین اور صالحین کی مختصر سی جماعت کے ذریعے مسلمانوں کی پوری قوم پر مستحکم غلبہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔

دین اور آئیڈیالوجی کے تصورات کے درمیان بعد المشرقین ہوتا ہے۔ کبھی کبھار تھوڑے سے عرصے کے لئے آئیڈیالوجی شاید دین کو متحرک کر سکے مگر ان کا دیرپا امتزاج کبھی بھی کامیابی سے ہمکنار نہ ہوگا اور معاشرہ میں توڑ پھوڑ کا موجب ہوگا۔

دین اللہ سبحانہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت پر مبنی ہوتا ہے اور اس کا ہدف ایک ایسے معاشرے کی تشکیل ہوتا ہے۔ جس میں امن وامان، صلح و آشتی، محبت و مروت اور خوشحالی کا دور دورہ ہو۔ ایسے معاشرہ کا دارومدار تزکیہ نفس، ایمان، عبادات اور باطنیت پر ہوتا ہے اس کے برعکس آئیڈیالوجی کا

مطمح نظر ایک ابھرتے ہوئے دنیوی معاشرہ کی تشکیل ہوتا ہے، جس کا دارومدار سیاسی تصور، عوامی تنظیم، عسکری جذبہ اور عقل کی حکمرانی پر ہوتا ہے۔ دین کا مطمح نظر تصادم سے پاک ایک روادار معاشرہ کی تشکیل ہے جبکہ آئیڈیالوجی اپنے عالمی نظریہ کی بڑے شدومد کے ساتھ حفاظت کرتی ہے اوراس کا مطمح نظر تصادم کے ذریعے کمزوروں پر غلبہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ بات حیران کن نہیں ہے کہ یورپ میں آئیڈیالوجی کا زمانہ شور وفساد اور جنگ وجدل کا زمانہ ہے، جس میں دو عالمی جنگیں بھی شامل ہیں۔

یہ مغرب کے شدید تسلط کا اثر تھا کہ ہندوستانی مسلمان سیاسی اور دینی زعما کی ایک پر رسوخ اکثریت مغربی فکر سے کلی طور پر مرعوب ومغلوب ہوگئی۔ یہاں تک کہ قرآن کے ابدی پیغام کو بھی لدی لدائی (Loaded) تفسیروں کے ذریعے مغربی اندازفکر سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئیں۔ مغرب کے فکری غلبہ کے تحت روحانی ترقی کو پس پشت ڈال کر مادی ترقی کے اہداف کو اپنالیا گیا۔ اس نظریاتی تغیر نے ہماری قومی زندگی کو کئی ایک انداز سے متاثر کیا اور ہماری قومی سوچ کا رخ ہی موڑ دیا۔ اس نظریاتی تغیر کے غلبہ کے تحت ہماری سوچ یہ ہوگئی کہ کامیابی اور فضیلت اخلاقی قوت سے نہیں بلکہ طاقت سے حاصل ہوتی ہے اس فکری تغیر نے ہماری توجہ انسان سازی کے اسلامی طریق کار سے ہٹا کر ابلاغیات، عوامی تحریکوں اور قوت کے استعمال پر مرکوز کردی۔ شمع سے شمع جلانے کا قدیم فن فراموش کردیا گیا اور ہمارا مطمح نظر ووٹوں کا حصول جا ٹھہرا۔

اس نظریاتی تغیر کی وجہ سے ہم اپنی ان روایتی تہذیبی، ثقافتی، علمی اور روحانی فضیلتوں میں بیگانہ ہوگئے، جن کی بدولت ہم ہندوستان میں ایک ہزار سال تک سرفراز رہے تھے۔ اس نظریاتی تغیر کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمیں باہر کی دنیا تو کیا ملنی تھی، ہماری اندر کی دنیا بھی برباد ہو کے رہ گئی۔ اس نظریاتی تبدیلی کے تحت ہم نے دین قیم کی اصلی روایت، جس کا دارومدار تعلق باللہ، تزکیہ نفس، رواداری اور اخلاص پر تھا، کو خیر باد کہہ کر آئیڈیالوجی کا طریق کار، جس کا انحصار نظریہ، جماعت، تصادم اور انقلاب پر تھا، کو اپنالیا۔ حیران کن امر یہ ہے کہ ہمارے سیاسی اور دینی عمائدین، جن کے پیش نظر اسلام کی عظمت رفتہ کی بازیابی تھی، نے ایک لمحہ کے لئے بھی اس مسئلہ پر غور نہ کیا کہ آخر اس دیرپا عروج وعظمت کا دارومدار کس شے پر تھا۔ بے شک اس عظمت ورفعت کا انحصار کسی

آئیڈیالوجی پر نہ تھا۔ ایک ہزار سال کے اس طویل عرصے میں نہ تو کسی اسلامی جماعت کی تشکیل کی گئی اور نہ ہی کسی اسلامی تحریک کا آغاز کیا گیا۔ بے شک اس کی ایک وجہ تو مسلمان فاتحین کی عسکری استعداد تھی۔ مگر اس کی بڑی وجہ بالخصوص مسلمان حاکمین، امراء، وزراء، علماء، صوفیاء اور اولیاء اور بالعموم مسلمان شہریوں (سول سوسائٹی) کی بے مثال خدمات، قربانیاں اور اعلیٰ کردار تھے۔ ان کے اخلاقی اور تمدنی اثر نے ہندوستانی معاشرہ کو ہر اعتبار سے تبدیل کر دیا۔

ہندوستان کے ایک ہزار سالہ اسلامی دور کی روایات کے برعکس 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد ہمارے دینی عمائدین کا فکری رخ مغرب کی طرف تھا، نہ کہ اللہ کی طرف۔ انہوں نے مسلمان عوام کو رجوع الی اللہ کی بجائے رجوع الی المغرب کی دعوت دی اور مغربی تعلیم اور ٹیکنالوجی کو اپنانے کی ضرورت پر زور دیا۔ ان کے مغرب کی طرف فکری جھکاؤ نے دور حاضر میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے ان کی توجہ مختلف نظریاتی اور اداراتی نظاموں کی طرف مبذول کرائی۔ انہیں اس بات کا احساس بالکل نہ رہا کہ بات اس نظام یا اس نظام کی نہیں بلکہ ایک مسلمان کے لئے اس کی باطنی اور ظاہری قوت کا راز تعلق باللہ میں ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اگر ان کے حکمرانوں کا اللہ سے تعلق برحق تھا، تو ہر قسم کے سیاسی نظاموں یا اداروں نے اچھے نتائج پیدا کئے اور جب کبھی یہ تعلق ماند پڑ گیا تو کوئی ادارہ بشمول خلافت کے اچھے نتائج پیدا نہ کر سکا۔

ہمارے اکابرین کی مغرب زدہ فکری روش اور یورپین نظریاتی تحریکوں کی طرف ذہنی جھکاؤ سے ہندو پاکستان کے مسلمان معاشرتی اور روحانی بحران کا شکار ہو گئے، جس سے وہ آزادی کے ترپین سالوں بعد بھی نکل نہیں پائے۔ ہمارے تمدنی اور معاشرتی ضعف و انحطاط کی بنیادی وجہ دو متضاد فطری روایات کو آپس میں خلط ملط کرنا ہے، جس سے تین حیاتی تعلقات مسخ ہو گئے ہیں اور یہ ہیں بندے اور اللہ کے درمیان تعلق، انسان اور انسان کے درمیان تعلق اور انسان اور ماحولات کے درمیان تعلق۔ عموماً ہم ان حیات بخش تعلقات میں اپنے پورے من و تن کے ساتھ داخل نہیں ہوتے بلکہ اپنی ذات کی ایک کسر کے ساتھ ہی یہ مقدس رشتے استوار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہماری اس مجہول کوشش کی وجہ سے ہمارا اللہ کے ساتھ رشتہ جزدی، انسان کے ساتھ رشتہ مطلبی اور ماحول کے ساتھ استحصالی ہو کے رہ جاتا ہے۔

ان شکستہ نسبتوں کو اگر کوئی شے جوڑ سکتی ہے تو وہ تصور توحید ہے۔ مگر ہم میں سے اکثریت کے لئے یہ مافیہ سے معرا ایک لفظ ہے۔ اس کی امکانی قوت پر گرفت تو دین اسلام کی مندرجہ بالا اصلی روایت پر علم وفہم سے بھرپور عمل کر کے ہی ہوسکتی ہے۔ اللہ کا فقط خیال وتصور کافی نہیں۔ اس سے صدق دل سے کلام اور ملاقات بھی ہونی چاہیے۔ اللہ کو نہ تو عطر سہ وقانون کے طور پر پیش کرنا چاہیے اور نہ ہی اس کی ذات بیکراں کو اپنی اپنی مخصوص عبادت گاہوں تک محدود کرنا چاہیے۔ توحید کے حصول کے لئے فقط رخ کا صحیح ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ اس کو حقیقت کا جامہ پہنانا پڑے گا۔ رخ (Orietation) جس کا تصور نظریہ کے ساتھ منسلک ہے دنیا کو ایک جامد، ضابطہ پسند مبنی بر عقل تجزیاتی نظام کے طور پر دیکھتا ہے جبکہ وصولیابی یا عمل پذیری (Realization) ایک تخلیقی شمولیت پر مبنی ہوتی ہے۔ اس عمل کے تحت انسان اپنی جبلی صلا ں کو کلی طور پر بروئے کار لاتے ہوئے کائنات کی امکانی قوتوں کا احاطہ کرتا ہے اور اس کا دائرہ عمل بے محیط ہوتا ہے۔ بے شک یہی دائرہ کار اسلامی تصوف اور دوسرے ادیان کے روحانی نظاموں کا ہے۔

تصوف ظاہری دنیا سے قطعہ تعلقی کا نام نہیں بلکہ یہ دنیاوی حرص سے باطنی بے تعلقی یا بے نیازی، قناعت اور استغنا کا نام ہے۔ صوفی اپنا باطنی تعلق دوسری دنیا سے جوڑے رکھتا ہے اور حالت استغراق میں رہتے ہوئے بھی وہ اس دنیا میں ایک فعال زندگی بسر کرتا ہے۔ دنیوی زندگی کا قیدی بننے کی بجائے وہ اپنی روحانی بصیرت کے مطابق اس دنیا کی تعمیر نو میں مشغول رہتا ہے۔ انسان اقرار تو ایک ہی اللہ کا کرتے ہیں مگر اپنی عملی زندگیاں اس ڈھب سے گزارتے ہیں جیسے کئی ایک خدا ہوں۔ بقول حضرت علامہ اقبال:-

ره مده درکعبه اے پیر حرم اقبال را
هر زماں درآستین دارد خداوندے دیگر

تصوف اس شرک کو عیاں کر کے انسان کی روح کو اس مہلک مرض سے نجات دلانا چاہتا ہے اور انسان کو ایسے مقام پر فائز کرنا چاہتا ہے جو اس کے شایان شان ہو۔

شیخ بشیر احمد شاد

(پاکستان)

(ڈاکٹر عبدالغنی فاروق)

میں 1928ء میں ضلع شیخوپورہ کے ایک گاؤں دھیان گالو کے ایک عیسائی خاندان میں پیدا ہوا۔ میرے والد متھیاس صاحب مشہور پادری تھے اور تبلیغی خدمات کے سلسلے میں اپنے آبائی ضلع گورداسپور سے شیخوپورہ میں منتقل ہو گئے تھے۔ میرے دادا مسمی جھنڈے مل بھی پختہ اعتقاد عیسائی تھے تبلیغی خدمات انجام دیتے تھے۔

میرے والد صاحب مجھے بھی ایک کامیاب مبلغ اور پادری بنانا چاہتے تھے، چنانچہ ابتداء ہی سے میری تعلیم اور تربیت مذہبی نہج پر ہوئی۔ پرائمری تعلیم میں نے ایس ڈی اے مشن سکول چوہڑکانہ منڈی میں حاصل کی۔ یہاں شروع ہی سے کوشش کی جاتی تھی کہ ہر بچہ بڑا ہو کر ایک اچھا مبلغ عیسائیت بن سکے۔ میں اپنی پڑھائی میں بڑا تیز تھا۔ سکول کے مذہبی کاموں کے علاوہ تبلیغی لٹریچر تقسیم کرنے والی پارٹیوں میں بھی شامل ہوتا۔ مجھے بچپن سے تقریریں کرنے اور تبلیغی خدمات انجام دینے کا بہت شوق تھا اور میرے اس شوق کو سارے اساتذہ اور پادری قدر اور شفقت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

پرائمری کے بعد میں ایس۔ ڈی۔ اے مشن ہائی سکول رڑکی چلا گیا۔ وہاں بھی میری تعلیمی و تبلیغی کارکردگی نمایاں رہی۔ یہاں میں نے عیسائیت کے بنیادی اصولوں مثلاً تثلیث، مسئلہ کفارہ، مسئلہ الوہیت مسیح اور الٰہیات کے بعض دیگر مسائل کی تربیت حاصل کی۔ اس سکول میں بھی عام اساتذہ خصوصاً جناب ایچ سی الیگزینڈر میرے معاملے میں بہت خوش اور مطمئن تھے۔ انہیں بجا طور پر میری صورت میں مستقبل کا ایک کامیاب مبلغ اور پادری نظر آ رہا تھا۔

اسی اثناء میں میرے والد کا تبادلہ راولپنڈی ہو گیا اور ساتھ ہی وہ حادثہ رونما ہوا جس نے میری دنیا تاریک بنا دی یعنی 1944ء میں میری والدہ محترمہ کا انتقال ہو گیا میرے والد صاحب نے دوسری شادی کر لی، تاہم ہماری نئی والدہ نے سارے بچوں سے محبت اور شفقت کا برتاؤ جاری رکھا اور آخر تک اس میں کوئی کمی نہ آئی۔

1947ء میں میرا تعلیمی اور تبلیغی کورس ختم ہو گیا اور میں نے اسی سال مسیحی کلیسا کے خادم کی

حیثیت سے لاہور میں اپنی خدمات کا آغاز کیا۔ میں رومن کیتھولک مشن کے ساتھ وابستہ ہوا تھا۔ 1947ء کے اواخر میں میری شادی شرق پور کے ایک پروٹسٹنٹ پادری گھرانے میں ہوئی۔ میری بیوی ایک راسخ العقیدہ عیسائی خاتون تھی۔

تبلیغی میدان میں میرا انداز بڑا جارحانہ تھا، جہاں میں عیسائیت کو دین حق کے طور پر پیش کرتا وہاں اسلام سے اس کا مقابلہ بھی کرتا اور زور شور کے ساتھ اسلام پر عیسائیت کی برتری ثابت کرتا۔ اس ضمن میں متعدد مسلمان علماء سے میری بحثیں ہوئیں، تاہم یہ بات عجیب ہے کہ دوران گفتگو میرے منہ سے عموماً اسلامی تراکیب واصطلاحات نکل جاتیں جس پر میرے ساتھی مجھے ٹوکتے اور خود میں بھی شرمندہ ہو جاتا۔ مثلاً الہامی کتب کا ذکر آتا تو میں بے ساختہ کہہ جاتا کہ الہامی کتابیں چار ہیں تورات، زبور، انجیل، قرآن مجید۔ خدا کے بجائے عموماً اللہ کا اور حضرت مسیح کی بجائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے الفاظ بول جاتا۔ عبادت کو نماز کہہ جاتا۔ وغیرہ

میری کلیسائی خدمت کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ وہ مشنری حضرات جن کے ساتھ میں کام کرتا تھا، اپنے وطن بیلجیم چلے گئے۔ میں نے ترقی دیہات کے سرکاری محکمہ میں شمولیت اختیار کر لی اور شیخوپورہ چلا گیا۔ خان انور طہماسپ خان پی۔سی۔ایس ضلع شیخوپورہ کے ڈویلپمنٹ آفیسر تھے۔ انہوں نے خاص شفقت کا برتاؤ کیا اور دفتر ہی میں خدمت کا موقع عنایت فرمایا۔ چونکہ میرا نام مسلمانوں جیسا تھا اس لئے مجھے بعض احباب مسلمان سمجھتے مگر جب انہیں پتہ چلتا کہ میں عیسائی ہوں تب بھی ان کے سلوک میں کوئی فرق نہ آتا اور ان کا برتاؤ مہر و مروت میں گندھا ہوا ہوتا۔ خصوصاً خان انور طہماسپ صاحب، میاں غلام سرور، نواز رومانی صاحب اور چودھری صفدر علی صاحب کا لطف و کرم مثالی نوعیت کا تھا۔ ان حضرات کی وجہ سے.......... اسلام کے بارے میں میرے شکوک وشبہات دور ہونے لگے، میرے دل میں اسلام کے لئے نرم گوشہ پیدا ہوتا گیا۔ اور میرے دل کی دنیا ایک صالح انقلاب کی طرف مائل ہونے لگی۔

اسی دوران میں بیلجیم والے مشنری واپس آ گئے اور مجھے دوبارہ تبلیغی خدمات انجام دینے کی دعوت دی مگر میں نے ان کے ساتھ کام کرنے سے انکار کر دیا۔ اس ضمن میں میری بیوی، باپ اور سسر نے بھی بہت زور دیا بلکہ خفگی اور برہمی کا مظاہرہ کیا، مگر میں اپنی ضد پر قائم رہا۔ مسلمانوں کے اتنے قریب رہنے کے بعد اب مشنری خدمات انجام دینے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

لیکن 1959ء میں ترقی دیہات یا ویلیج ایڈ کا محکمہ ختم ہو گیا تو تبلیغی خدمات انجام دینے کے

لئے مجھ پر دوبارہ زور ڈالا گیا اور اس مرتبہ میں دیر تک مزاحمت نہ کر سکا تاہم یہ ارادہ ضرور کر لیا کہ اب عیسائیت کی تبلیغ کرتے ہوئے اسلام پر کبھی کوئی اعتراض نہیں کروں گا۔ بلکہ خدا نے موقع دیا تو اسلام کے خلاف ان تمام اعتراضات کو حقیقت و تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش جاری رکھوں گا۔

میری تبلیغی مہمات کا مرکز شیخوپورہ تھا، مگر ہفتے میں دو مرتبہ مسیحی بشارت کے لئے ضلع لاہور میں بھی مدعو کیا جاتا۔ مجھے تبلیغی جوہر ورثے میں ملے تھے، جنہیں میری محنت اور طباعی نے جلا عطا کی تھی۔ چنانچہ میں ہر قسم کی تقاریر خود ہی تیار کرتا۔ انجیل کے مختلف حصوں کو نظم کی صورت دیتا اور نہایت خوبصورت موثر آواز میں خود ہی پیش کرتا۔ ایک خوش الحان پادری کی حیثیت سے میں عوام کو گھنٹوں متوجہ رکھتا تھا۔ میری مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ بیشتر مقامی پادری میری نظمیں اور گیت الاپتے تھے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ اسلامی ماحول نے مجھ پر کچھ ایسا جادو کر دیا تھا کہ میں نے مسلمانوں میں اپنے حلقہ احباب کو قائم ہی نہیں رکھا، بلکہ اسے وسعت بھی دی۔ میرے بیوی اس پر سخت برافروختہ ہوتی اور اپنے اور میرے والدین کو آگاہ کرتی رہتی۔ کبھی جوش میں آ کر گھر میں اسلام کی کوئی خوبی بیان کر دیتا تو گویا طوفان اٹھ کھڑا ہوتا اور کئی روز تک فضا میں تلخی رہتی پھر بھی میں نے ہمت نہ ہاری اور اسلام کے بارے میں میرا تجسس آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔

1961ء میں ایک مرتبہ میں اپنے والدین کو ملنے لاہور گیا۔ والد صاحب کے پاس کرسچن کونسل لٹریچر بورڈ کے سیکرٹری مسٹر پی جے ایکٹن بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں معلوم ہوا کہ میں سابق ویلیج ایڈر ہوں اور فیلڈ کے تجربہ کے علاوہ لکھنے بولنے اور گانے میں بھی ماہر ہوں تو انہوں نے میری خدمات حاصل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور ایک چٹھی دے کر گوجرانوالہ میں مسٹر پال ای ہوسٹیٹر کے پاس بھیجا۔ ہوسٹیٹر پاکستان میں مسیحی تعلیم بالغاں کے پروگرام کے ڈائریکٹر تھے۔ اس پروگرام کے چلانے کے لئے انہیں ایک موٹی ویٹر کی ضرورت تھی۔

مسٹر ہوسٹیٹر ماہر نفسیات و لسانیات تھے۔ انہوں نے بخوشی میری تقرری کر دی اور میں گوجرانوالہ منتقل ہو گیا۔ میری بیوی بچے بھی یہیں مشن کمپاؤنڈ کھوکھر کی گوجرانوالہ آ گئے۔

تعلیم بالغاں کا یہ پراجیکٹ جو ویسٹ پاکستان کرسچن کونسل کی طرف سے شروع ہوا، اس کی تمام مالی امداد نیویارک سے آتی تھی، اس کے حسب ذیل چار شعبے تھے۔

1- ریسرچ اینڈ پبلی کیشن (تحقیق و اشاعت)
2- علمی تربیتی کورس برائے اساتذہ و سپروائزر وغیرہ
3- مسیحی علمی لٹریچر کی تقسیم و فروخت
4- تبلیغ و ترغیب مجالس وغیرہ

ان چاروں شعبوں کا بیشتر بوجھ میرے کندھوں پر ڈالا گیا اور میں پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ اس کام میں جت گیا، میں نے فرائض کی ادائیگی میں دن دیکھا نہ رات، چنانچہ اس علاقے کا ہر عیسائی اس امر کی گواہی دے گا کہ میں نے علمی، تعلیمی اور تبلیغی خدمات کس تندہی سے انجام دیں۔ ان فرائض کے سلسلے میں پاکستان کے تقریباً ہر بڑے شہر اور قصبے میں جانا پڑتا تھا۔ میری یہ خدمات اتنی وقیع تھیں کہ مسٹر پال ای ہوسٹلر نے مجھے ہر طرح کی سہولیات فراہم کر رکھی تھیں۔ سفر میں مجھے سیکنڈ کلاس کی سہولت حاصل تھی اگر گھر سے باہر کہیں رات بسر کرنی پڑتی، تو تمام راتوں کا الاؤنس دس روپے فی رات ملتا تھا۔ دیگر اخراجات سفر بھی ادارہ کے ذمہ ہوتے۔ تنخواہ تقریباً چھ سو روپیہ ماہوار تھی اور یہ رقم اس کے علاوہ تھا، بچوں کے تعلیمی وظائف ایک سپیشل فنڈ سے ادا ہوتے۔ میڈیکل الاؤنس بھی اسی میں سے ملتا ہر کرسمس پر ڈیڑھ سو روپے الگ ملتے۔ گرمیوں کی تعطیلات میں ایک ماہ کی زائد تنخواہ ملتی۔ گندم خریدنے کے لئے آسان قسطوں پر پانچ سو روپے کا قرضہ ملتا۔ میری ہر کتاب پر تین سو روپے تک رائلٹی ملتی یہاں تک کہ بیس ہزار روپے میں میرا امدادی بیمہ بھی کرا دیا گیا تھا تا کہ میری ناگہانی موت کے بعد میرے بیوی بچے بے سہارا نہ ہوں۔

یہ ساری سہولتیں میسر تھیں، مگر قلبی سکون حاصل نہ تھا۔ میں اپنے آپ کو اندھیروں میں بھٹکتا ہوا محسوس کرتا تھا، صاف نظر آتا تھا کہ میں لوگوں کو بزعم خویش حق کی تعلیم دیتا تھا، حالانکہ خود جہالت کی تاریکیوں میں سرگرداں تھا اور عوام کو روشنی کی طرف بلاتا تھا جبکہ خود نور کی ایک کرن کے لئے ترس رہا تھا۔ تبلیغی و علمی خدمات کے دوران میں یہ احساس مجھے متواتر تنگ کرتا رہتا۔ میں اپنے عہد کے مطابق اسلام پر اعتراض تو کوئی نہ کرتا تھا، مگر یہ خیال ذہن میں کچوکے لگاتا رہتا کہ میں عیسائیت کی تبلیغ کر کے اپنے آپ کو اور دنیا کو دھوکا دے رہا ہوں، خصوصاً دو سوال تو روح کی پھانس بن گئے اور میں ان کے بارے میں اکثر سوچتا رہتا۔

1- اگر عیسائیت ایک سچا مذہب ہے اور اسی کی تقلید پر انسان کی نجات کا دارومدار ہے تو یہ

مذہب زوال کی طرف کیوں جارہا ہے؟ حالانکہ کہا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد محبت واخلاق پر ہے۔

2-اس کے برعکس اسلام کو ہر عیسائی جھوٹا خیال کرتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد ظلم و تشدد اور تلوار پر قائم ہے پھر یہ اس قدر ترقی کیوں کر گیا؟ جبکہ ظلم وتشدد انسانی فطرت کے خلاف ہے۔

انہی دو بنیادی مسائل کا تقابل مجھے راہ تجسس پر دور تک کھینچتا چلا گیا اور میں ذہنی وقلبی اضطراب کو لئے ہوئے تلاش حق کے لئے ادھر ادھر سرگرداں رہا۔علمائے کرام سے اعتراضات کی صورت میں گفتگو کا ایک ہی مقصد ہوتا اور علمی و تحقیقی طلب وجستجو کا بھی اب ایک ہی مدعا تھا۔یعنی دل کی اس خلش کا علاج جو متذکرہ بالا مسائل نے پیدا کر دی تھی۔تجسس کی یہ مدت دس سال کے عرصے پر محیط ہوگئی۔الحمد اللہ کہ اندھیرے کے تمام پردے ایک ایک کر کے نگاہوں سے ہٹتے چلے گئے۔ذہن کے سارے شکوک دور ہو گئے۔اسلام ایک روشن جگمگاتا ہوا سورج بن کر میرے سامنے آ گیا اور اب اس سے انکار کرنا ممکن نہ رہا۔چنانچہ 23 جون 1968ء کا مبارک دن تھا جب میں اپنے دس افراد خانہ کے ساتھ گوجرانوالہ کی مکی مسجد میں گیا اور مولانا محمد یوسف کاشمیری کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیا۔(الحمد اللہ تعالیٰ)

یہاں پر ایک دردناک حادثے کا ذکر بہت ضروری ہے۔میں روحانی سکون کی تلاش کے آخری مراحل طے کر رہا تھا کہ میری دیرینہ رفیقہ حیات ایک طویل بیماری کے بعد فوت ہوگئی۔میں نے دوسری شادی کر لی اور اس خدا کی بندی سے جونہی میں نے اسلام کی بات کی،اس نے اس کی تائید کی اور تلاش حق کے سلسلے میں میری سرگرم مویدومونس بن گئی۔اللہ اسے جزائے خیر عطا کرے۔

آخر میں، میں نہایت اختصار کے ساتھ اسلام اور عیسائیت کے ان عقائد کا تجزیہ پیش کرتا ہوں،جنہوں نے ایک عرصے تک مجھے تحقیق وتجسس کے میدان میں محوسفر رکھا۔

سب سے پہلے مجھے تثلیث کے مسئلے نے پریشان کیا۔عیسائی عقیدے کے مطابق ایک خدا میں تین اقانیم ہیں۔(1) یعنی باپ، بیٹا اور روح پاک، جسے وہ انسان کے جسم میں تین چیزوں، میری سمجھ، میری یاد اور میری مرضی سے بھی تشبیہ دیتے ہیں۔وہ تثلیث کو بہت بڑا بھید بھی کہتے ہیں جو انسان کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔میں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ عیسائی لوگ پہلے ایک خدا کہہ کر توحید کا اقرار کرتے ہیں مگر پھر ایک خدا میں تین شخص کہہ کر توحید کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔دوسرے

لفظوں میں اقرار تو توحید کا کرتے ہیں مگر مانتے تثلیث کو ہیں۔ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔

پھر یہ بات بھی خاصی پریشان کن تھی کہ تثلیث کا بھید انسان کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ ظاہر ہے جو چیز شعور کے احاطے میں نہ آ سکے اس پر عمل کی عمارت کیسے کھڑی ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس زمین و آسمان، کائنات اور مخلوقات کا سارا نظام پکار پکار کر گواہی دیتا ہے کہ خالق حقیقی وحدہ، لاشریک ہے یعنی توحید کا تصور عام فہم ہے اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ تمام الہامی کتابیں بھی اس کی شہادت دیتی ہیں مثال کے طور پر۔

تورات خروج آیت 22/20 جو کوئی واحد خدا کو چھوڑ کر کسی اور معبود کے آگے قربانی چڑھائے گا، وہ نیست و نابود کر دیا جائے گا۔

سلاطین آیت 8/10 خداوند ہی خدا ہے، اس کی مانند اور کوئی خدا نہیں۔

زبور۔ آیت 86/10 تو ہی بزرگ ہے تو ہی واحد خدا ہے۔

انجیل۔ متی آیت 19/17 تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے کیونکہ نیک تو ایک ہی ہے۔

قرآن تو ظاہر ہے توحید کی دعوت اور مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔

چنانچہ خدا کا شکر ہے کہ میں تثلیث کے غیر عقلی عقیدے سے منحرف ہو گیا اور توحید پر ایمان لے آیا۔

عیسائیت میں قرآن کو الہامی کتاب نہیں مانا جاتا اور کہا جاتا ہے کہ قرآن دراصل تورات، زبور اور انجیل کی نقل ہے۔ چنانچہ توحید کے بعد مجھے ایسے دلائل مطلوب تھے جو قرآن پاک کو آسمانی کتاب ثابت کر دیں۔ شکر ہے کہ تحقیق نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔

رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں مسیحی فرقوں کی بائبلوں میں زبردست تضاد ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ دونوں فرقے ایک دوسرے کی کتابوں کو غلط کہتے ہیں اور ساتھ ہی ان کے الہامی ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر رومن کیتھولک کی بائبل میں عہد عتیق (پرانے عہد نامے) کے صحیفوں کی تعداد 46 ہے اور عہد جدید یا نئے عہد نامے کی تعداد 28 ہے یعنی کل 74 ہے۔ جبکہ پروٹسٹنٹ فرقے میں عہد عتیق اور عہد جدید کے صحیفوں کی بالترتیب تعداد 39 اور 27 ہے جو 66 بنتی ہے۔ بائبلوں میں تضاد ہونے کے علاوہ ان کی آیات میں بھی تضاد ہے۔ چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔

پیدائش 3/9 آیت میں ہے کہ "خدا غیب کا علم نہیں رکھتا۔"

متی 24/36 مرقوم ہے کہ " خدا کو غیب کا علم ہے اور اس کے سوا کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا۔" مجھے تحقیق کے باوجود آج تک کوئی عیسائی بائبل کا حافظ نہیں ملا، چنانچہ اگر دنیا بھر سے بائبل کے نسخے نابود ہو جائیں تو بائبل کا وجود ختم ہو جائے گا۔ جبکہ یہ بات مسلم الثبوت ہے کہ قرآن نہ صرف ہر نوع کے تضاد یا تحریف سے پاک ہے، بلکہ لاکھوں حفاظ کے سینوں میں محفوظ بھی ہے اور صدیاں گذر جانے کے باوجود اس کی زیر زبر میں بھی فرق نہیں پڑا۔ بائبل کا متن پکار پکار کے کہتا ہے کہ یہ تغیر و تبدل کے بہت سے مراحل سے گذرا ہے، مگر قرآن کے بارے میں ایسی کوئی بات ثابت نہیں کی جاسکتی۔ محکم اور اٹل دلائل نے میرا ایمان قرآن پر بھی راسخ کر دیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ فی الواقع یہ خدائے تعالیٰ کا کلام پاک ہے۔

بچپن سے سنتا آ رہا تھا کہ اسلام ظلم و تشدد کا علمبردار ہے اور یہ تلوار کے زور سے پھیلا ہے، جبکہ عیسائیت محبت و اخلاق سے پھیلی ہے۔ اس میں کسی پر ظلم و زیادتی نہیں کی جاتی۔

مگر پیدائشی مسیحی ہوتے ہوئے بھی یہ بات میرے مشاہدے میں آتی رہی کہ برصغیر میں انگریزوں کے آنے کے بعد لوگ پیار و محبت سے عیسائی نہیں ہوئے بلکہ انہیں دنیاوی لالچ دے کر عیسائی بنایا گیا اور روحانی سکون کی طرف کھینچنے کی بجائے انہیں دنیاوی عیش و آرام کی طرف اکسایا جاتا تھا۔ چنانچہ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ پاک و ہند میں جتنے لوگ بھی عیسائی ہوئے وہ کسی نہ کسی دنیاوی مفاد اور مادی لالچ میں گرفتار ہوئے۔

پھر یہ بات بھی میرے تجربے میں آئی کہ غیر ملکی مشنری امریکہ اور یورپ سے بھاری رقمیں منگاتے تو مقامی عیسائیوں کی امداد کے نام پر ہیں مگر وہ خرچ اپنی ذات پر کرتے ہیں۔ انہیں کالے عیسائیوں سے کوئی محبت نہیں ہوتی۔ وہ اس کو کاروبار سمجھتے ہیں اور تبلیغ کے نام پر دراصل خود گلچھڑے اڑاتے ہیں۔ بلکہ یورپ کی طاقتوں نے خصوصاً اسلام کو ختم کرنے کے لئے بڑے سے بڑے ظلم اور دھونس اور دھاندلی سے بھی گریز نہیں کیا۔

اس کے برخلاف مجھے یاد نہیں کہ پاکستان میں کبھی کسی غیر مسلم کو مسلمان ہونے پر مجبور کیا گیا ہو۔ یہی عالم دوسری اسلامی دنیا کا ہے۔ ہندوستان میں صدیوں تک مسلمان حکمران رہے مگر ہندو آخر تک اکثریت میں رہے اور آزادی سے اپنے مذہب پر عمل کرتے رہے۔ انڈونیشیا اور ملائشیا میں کبھی اسلامی فوجیں گئی ہی نہیں مگر وہ اکثریتی مسلم ممالک ہیں۔ تلوار یا تو دفاع کے لئے ہے یا ظالم انسان دشمن قوتوں کے لئے ورنہ نبی اسلام حضرت محمدؐ کی زندگی سے لے کر ساری اسلامی

تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام رحم وکرم، محبت وشفقت اور انسانی ہمدردی کا بے نظیر مرقع ہے اور اس پر تشدد کا الزام جھوٹ اور بہتان کے سوا کچھ نہیں۔

حضرت محمدؐ کی شادیوں کو عیسائی خوب اچھالتے ہیں۔ چنانچہ میں بھی برسوں تک ایک پادری کی حیثیت سے اس امر کو اعتراض کی صورت دے کر پھیلاتا رہا، مگر تحقیق کی اور خدا نے میری آنکھیں کھول دیں تو معلوم ہوا کہ حضورؐ کی ہر بات میں حکمت پوشیدہ تھی۔ انہوں نے جتنی بھی شادیاں کیں ان سب کے پس پردہ کسی نہ کسی جاہلی رسم کی تردید یا اسلامی تعلیم کی اشاعت کا مقصد ہوتا تھا۔ پھر تاریخ بتاتی ہے کہ کئی نبیوں نے بیک وقت بہت سی شادیاں کیں۔ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی عورتوں سے تنفر نہ تھے اور کسی پیغمبر کو شادی کرنے سے نہیں روکا گیا۔

عیسائیوں کی طرف سے عام اعتراض کیا جاتا ہے کہ مسلمان ایک سے زیادہ شادیاں کرتے ہیں۔ میں نے غور کیا کہ اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو اپنے نبیؐ کے طریقے پر عمل کرتے ہیں مگر عیسائی ایک شادی کر کے بھی اپنے نبی کی سنت کی خلاف ورزی کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سرے سے شادی کی ہی نہیں تھی۔ پھر ایک شادی کرنا اور بیک وقت بہت سی عورتوں کے ساتھ ناجائز مراسم استوار کرنا آخر کہاں کی دیانت اور شرافت ہے اور یہ سب کچھ عیسائیت کی کون سی تعلیم کے تحت کیا جاتا ہے؟

دین اسلام کے جس پہلو نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ مساوات کی تعلیم ہے۔ حلقہ اسلام میں بلا امتیاز سب مسلمان برابر ہیں، فضیلت ہے تو صرف نیکی، پارسائی اور تقویٰ و پرہیزگاری کی۔ مساجد میں حاکم ومحکوم، گورے کالے، امیر غریب سب ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ یہاں عیسائیوں کی مانند گوروں اور کالوں کے گرجے الگ الگ نہیں ہوتے۔ امیر لوگ عبادت کے وقت کرسیوں پر نہیں بیٹھتے نہ غریب اور ناخواندہ لوگ فرش پر بیٹھتے ہیں۔ بلکہ یہاں تمام کی حیثیت برابت اور یکساں ہے۔ اسلام مساوات اور احترام انسانیت کا مذہب ہے اور جس دین میں مساوات ہے وہی دین حق ہے۔

موت سے پہلے

(مولینا منور حسین دہلوی)

کوئی وقت ایسا بھی تھا کہ اللہ تعالٰی کی ذات کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس نے اپنی قدرت کاملہ سے ہر شے کو پیدا فرمایا۔ ہمیشہ رہنے والی ذات اللہ تعالٰی کی ہے اور ہر انسان کے لئے موت ضرور آئے گی اس لئے عقلمند کو چاہیے کہ اپنے انجام کا خیال رکھے اور یاد کرتا رہے کہ ایک دن وہ نہیں تھا اور وقت آنے والا ہے کہ وہ پھر نہیں رہے گا۔ دنیا کا متاع بھی سب یہاں رہ جائے گا اور خالی ہاتھ یہاں سے جائے گا صرف اعمال اس کے ساتھ ہونگے۔

اللہ تعالٰی کا کس قدر فضل وکرم ہے کہ اس مجبور محض انسان کو بے شمار نعمتوں سے نواز دیا اور پھر جب چاہتا ہے آناً فاناً میں مجبور اور دنیا کی تمام نعمتوں سے محروم کر دیتا ہے اور کسی کو دم مارنے کی گنجائش نہیں نہ کسی میں اللہ تعالٰی کے حکم کے بغیر موت کو ٹالنے کی طاقت ہے۔ کیا ایسی عارضی زندگی میں اپنے خالق و مالک کو بھولنے کا کوئی جواز ہوسکتا ہے۔

دو روزہ زیست غنیمت ہے ذکر حق کر لو
بدن میں جاں دہن میں زباں رہے نہ رہے

حضور اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ جو آدمی اللہ تعالٰی کے دیدار (ملاقات) کا طالب ہے اللہ تعالٰی بھی اس کی ملاقات پسند فرماتا ہے اور جو آدمی اللہ تعالٰی کی ملاقات کو ناگوار سمجھتا ہے اللہ تعالٰی بھی اس سے ملنا پسند نہیں کرتا۔ اس پر ایک زوجہ مبارکہؓ نے عرض کی حضورؐ عام طور پر ہم انسان تو موت کو پسند نہیں کرتے۔ تو حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ یہ درست نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مومن کے پاس جب موت کا فرشتہ آتا ہے تو وہ اللہ تعالٰی کی جانب سے خوش خبری سے نوازا جاتا ہے اور اس کو وہ بڑے مرتبے نظر آتے ہیں جو موت کے بعد ملیں گے تو پھر اسے سب سے زیادہ موت ہی پیاری معلوم ہوتی ہے۔ تو یہ اللہ تعالٰی کی ملاقات کے طلب کرنے کی دلیل ہے۔ بس ایسے ہی لوگوں سے

اللہ تعالیٰ ملنے کا طالب ہے۔ مگر جب موت کافر کے سامنے آتی ہے تو اس کے سامنے مرنے کے بعد کے عذاب اور سزا کا نقشہ پیش ہو جاتا ہے تو وہ گھبرا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حضور جاتے ہوئے ڈرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو اپنے دیدار سے محروم فرما دیتا ہے۔ (بخاری مسلم)

سبحان اللہ! جس طرح ایماندار بندہ اپنی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر کر کے اس کے انعامات سے خوش ہوتا ہے اور ہر آن اپنے مولیٰ کو حاضر و ناظر جان کر اس کی رضا اور خوشی حاصل کرنے میں انتہائی خوشی پاتا ہے۔ اور اگر کسی وقت مولیٰ کی طرف سے امتحان کے طور پر کچھ دکھ یا تکلیف ہوتی ہے تو صبر کر کے اللہ تعالیٰ کے قرب اور سکی معیت سے مسرور رہتا ہے اور اپنے مالک کے دربار میں گڑگڑا کر عافیت اور آرام کی التجا کرتا ہے۔ گویا کہ ہر صورت میں اپنے مالک کے حضور حاضر رہتا ہے۔ تو اب موت کے بعد تو اللہ تعالیٰ کے بے کیف دیدار میں کسی قسم کی رکاوٹ بھی نہیں ہوگی۔ نہ کوئی آرزو نہ تمنا، نہ بیوی نہ بچے، نہ دوست نہ احباب، نہ کھانے پینے پہننے اوڑھنے اور کسی دوسرے کام کاج کی فکر۔ صرف دیدار محبوب حقیقی ہی ہے۔ ایسی مبارک ساعت اور گھڑی کو اللہ تعالیٰ کے دیدار کے طالب تمام مسرتوں پر ترجیح کیوں نہ دیں گے۔ حضرت ذوق نے حسرت دیدار کو کس خوبی سے بیان کیا ہے۔

جاتے ہو آنکھیں بند کئے ذوقؔ تم کہاں
یہ راہ وصل یار ہے راہ عدم نہیں

بلکہ اپنے خالق و مالک اور محبوب حقیقی کے چاہنے والے تو یہاں بھی اس کے دیدار سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

دیکھ گر دیکھنا ہے ذوقؔ کہ وہ پردہ نشیں
روزن دیدہ دل سے ہے دکھائی دیتا

اسی لئے تو فرماتا ہے۔ **نحن اقرب الیہ منکم ولکن لا تبصرون o "**

میں تو تمہاری جانوں کی نسبت بھی تم سے زیادہ قریب ہوں مگر تم مجھ کو دیکھتے نہیں یعنی دیکھنے کی خواہش نہیں کرتے۔"

ایک اور حدیث شریف ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے کہا کہ حضور اکرمؐ نے میرا کندھا پکڑ کر فرمایا کہ دنیا میں مسافر کی طرح رہو یا راستہ طے کرنے والے کی طرح۔ اور ابن عمر کہا کرتے تھے کہ اے انسان جب تو شام کرے تو صبح کے وقت کا انتظار نہ کر۔ اور صبح ہو جائے تو شام کا انتظار نہ کر۔ اور اپنی طاقت اور تندرستی میں بیماری کے لئے سامان کر لے۔ کہ صحت کے وقت کمزوروں اور بیماروں کی مدد کر، ان کی تکلیف دور کرنے کی کوشش کر کہ اللہ تعالیٰ تیری بیماری میں تجھ کو اس کا بدلہ دے۔ اور اپنی زندگی میں موت کے لئے جمع کر لے۔ ایسے نیک اور خدا تعالیٰ کی خوشی کے کام کر کہ موت کے بعد تیرے لئے قبر اور عالم برزخ میں آرام کا ذریعہ بن جائیں۔ (بخاری مسلم)

حضور اکرمؐ اور تمام اہل بیتؓ اور صحابہ کبارؓ نے مسافروں کی طرح زندگیاں گزاریں۔ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے مال و دولت سے دنیا والوں کو فائدے پہنچاتے رہے اور مکانات جائیداد یا اپنے عیش و آرام کے اسباب جمع نہیں کئے۔ بلکہ تمام عمر زندگی بھر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور بندگان خدا کی فلاح و بہبود میں مصروف رہے۔ چونکہ ان کو یقین کامل تھا کہ دنیا تو سرائے کی طرح ہے کہ آدمی خالی ہاتھ آتا اور چند دن رہتا ہے اور پھر خالی ہاتھ چلا جاتا ہے۔ ہر چیز سرائے یا دنیا کے مالک اللہ تعالیٰ ہی کے قبضے اور تصرف میں رہتی ہے۔ اسی لئے وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کی دل شکنی نہیں کرتے تھے۔ مسلمانوں کو لازم ہے کہ حضور اکرمؐ کے مبارک طریقوں کو اپنا کر اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت دیتے رہیں کہ اسی میں فلاح دارین کا راز ہے۔

(اقتباس از کتاب "مکمل نماز")

چھوٹا منہ بڑی بات

ذکر

(قدرت اللہ شہاب)

راہ سلوک میں ذکر کا درجہ سرفہرست ہے۔ حقیقت ذکر ایسی چیز کو یاد رکھنا ہے جو ظاہری اور باطنی گناہوں کو روک دے اور طاعات پر ہمت کو چست کر دے۔ اگر کسی کو جنت اور دوزخ کی یاد گناہوں سے روکے۔ اس کے لئے یہی ذکر اللہ ہے جس کسی کو **اللہ اللہ یا لا الہ الہ اللہ** کا ورد کرنا گناہوں سے روکے، اس کے واسطے یہی ذکر اللہ ہے جس کو اشغال یا مراقبات معاصی سے روکیں۔ اور طاعات پر اکسائیں اس کے واسطے یہی ذکر اللہ ہے اگر کوئی شخص یہ سب کچھ تو دن رات کرتا رہے لیکن نہ تو گناہوں سے باز رہے اور نہ ہی طاعات اختیار کرے تو یہ ذکر اللہ حقیقی نہ ہوگا بلکہ محض ذکر کی صورت ہوگی۔

ذکر کی کوئی حد نہیں۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج سب کی حد ہے لیکن ذکر لامحدود ہے اللہ کے ذکر میں ایک عجیب توانائی، لطیف نشاط اور عمیق سکون ہے، عام طور پر ذکر کی چار قسمیں ہیں جنہیں آسانی سے آزمایا جاسکتا ہے۔ اول ناسوتی جیسے **لا الٰہ الا اللہ** دوسرے ملکوتی جیسے **الا اللہ**، تیسرے جبروتی جیسے **اللہ**، چوتھے لاہوتی جیسے **ھو ھو**۔ زبان کے ذکر کو ناسوتی، دل کے ذکر کو ملکوتی، روح کے ذکر کو جبروتی اور سارے وجود کے اجتماعی ذکر کو لاہوتی کہتے ہیں۔

ذکر کی ان چار قسموں میں بھی ایک ایک قسم کے کئی کئی طریقے ہیں، جن طریقوں کی تھوڑی بہت مشق مجھے نصیب ہوئی۔ ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں:۔

اسم ذات: یعنی اللہ اللہ کا ذکر یک ضربی، دوضربی، سہ ضربی، اور چہار ضربی اگر اس ذکر کو ہر ضرب میں اس تصور کے ساتھ کیا جائے کہ جدھر منہ پھیر و ادھر ہی خدا ہے۔ تو استغراق اور محویت کی کیفیت پیدا ہو کر ہر شے سے ذکر کی آواز سنائی دینے لگتی ہے اور قرآن مجید کے اس فرمان کی کا ئن تصدیق ہو جاتی ہے کہ دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جو خدا کی حمد کی تسبیح نہ کرتی ہو۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ معجزہ تھا کہ جب وہ خود ذکر کرتے تھے، تو پہاڑ اور طیور بھی ان کا ساتھ دیتے تھے۔

اسم ذات کا دوسرا ذکر پاس انفاس ہے۔ سانس باہر کرتے وقت لفظ **اللہ** کو سانس میں لائے اور سانس کو لیتے وقت **ھو** کو اندر لائے اور تصور کرے کہ ظاہر و باطن میں ہر جگہ اللہ ہی کا ظہور ہے۔ اس ذکر کی اس قدر غیر معمولی کثرت کرے کہ سانس ہمہ وقت ذکر کی عادی ہو جائے۔ اس طرح پاس انفاس سے بہرہ در ہو کر قلب غیر اللہ سے صاف اور دیگر کدورتوں سے پاک ہو کر انوار الٰہیہ کا محور بن جاتا ہے۔

نفی واثبات (**لا الہ الا اللہ**) کو پاس انفاس میں رچانا ایک خوشگوار عمل ہے سانس لیتے وقت صرف سانس سے **الا اللہ** کہے اور سانس باہر آتے وقت **لا الہ** کہے منہ بالکل بند رکھے اور زبان کو ادنیٰ حرکت بھی نہ دے۔ اور اس قدر پابندی اور استقلال سے کام لے کہ سانس خود بخود بلا ارادہ ذکر کرنے لگے۔

اسی طرح جس نفی واثبات اور ذکر اسم ذات کے بھی کئی طریقے ہیں۔ ان اذکار کے ساتھ کئی طرح کے اشغال بھی وابستہ ہیں۔ مثلاً شغل سلطاناً نصیراً، شغل سلطاناً محموداً، شغل سلطان الاذکار، شغل سرمدی وغیرہ۔ ہر ذکر اور شغل میں لطف وانبساط کا اپنا اپنا رنگ ہے لیکن شغل سرمدی نے خاص طور پر مجھے اپنے نشاط کی گرفت میں دبوچ لیا۔ اگر خدا کی مدد شامل حال نہ ہوتی۔ تو ممکن تھا کہ میں اسی شغل کی سرمستی و بے خودی میں منہمک ہو کر ساری زندگی اسی میں ضائع کر دیتا۔ اس شغل کی خصوصیت یہ تھی کہ شروع میں دماغ پر پہاڑی جھرنے کی طرح پانی گرنے کی آواز آنے لگی۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے سمندر کی لہروں کے ایک بلند آہنگ اور مستانہ ساز ینے کا روپ دھار لیا۔ بجلی کی لہر کی طرح اس ساز ینے کی آواز تمام بدن میں سرایت کر کے گنبد کی طرح گونجنے لگی جسے اصطلاح صوفیہ میں صوت حسن وہمس کہتے ہیں۔ اس آواز سے کبھی الہام کی شعاعیں پھوٹنے لگتی ہیں۔ کبھی اس میں عجیب وغریب عارفانہ علوم ورموز منکشف ہوتے ہیں۔ کبھی بجلی کی سی کڑک، گرج اور کوند ظاہر ہوتی ہے جس سے جسم کانپنے لگتا ہے۔ اور بے خودی اور محویت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کبھی چاند، سورج اور بجلی کی طرح روشنی کا سیلاب امڈ آتا ہے جسے سالک غلطی سے نور حق کی تجلی سمجھ بیٹھتا ہے۔ لیکن یہ نور ذات کی تجلی نہیں ہوتی بلکہ راہ سلوک پر ایک

دلفریب اور خوشنما رکاوٹ ہوتی ہے جو شخص یہاں پر آ کر اٹک گیا۔ وہ یقیناً منزل شریعت کی راہ سے بھٹک گیا۔ ان کیفیات پر میرا اپنا دل بھی بری طرح لٹو ہو رہا تھا۔ لیکن خدا بھلا کرے میرے رہنما کا جس نے ایسی ڈانٹ پلائی کہ کانوں کے کیڑے جھڑ گئے۔ اور گردن سے پکڑ کر مجھے اس جنجال سے نکال باہر کیا۔

مراقبہ

ذکر اور شغل کے بعد مراقبہ کی باری آتی ہے۔ مراقبہ کی اصطلاح رقیب کے لفظ سے نکلی ہے جسے نگہبان اور محافظ کہتے ہیں۔ مراقبہ بھی دل کو غیر اللہ کی یاد سے محفوظ رکھنے کا ذریعہ ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس آیت یا کلمہ کا مراقبہ منظور ہو، اس کو بار بار زبان سے دہرائے اور دل کو دوسرے تمام خیالات سے خالی کر کے اس کے معانی میں اس قدر منہمک ہو جائے کہ دنیا و مافیہا سے بھی حتی الوسع بے خبر ہو جائے۔ بلکہ یہاں تک کہ اپنا بھی خیال دل سے نکل جائے۔ زمین و آسمان درہم برہم ہو کر غائب ہو جائیں اور صرف خدا کی ذات کو موجود اور باقی تصور کرے، جن آیات کا مراقبہ کرنے کی میں نے کسی قدر کوشش کی ہے وہ یہ ہیں۔

(۱) اللہ نور السمٰوٰت والارض — مراقبہ نور

(اللہ زمین و آسمان کا نور ہے)

(۲) الم یعلم بان اللہ یریٰ — مراقبہ ردیت

(کیا وہ نہیں جانتا ہے کہ خدا دیکھتا ہے)

(۳) وھو معکم اینما کنتم — مراقبہ معیت

(جہاں کہیں تم ہو خدا تمہارے ساتھ ہے)

(٤) ونحن اقرب الیہ من حبل الورید — مراقبہ اقربیت

(اور ہم انسان کے اسقدر قریب ہیں کہ اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ)

(۵) وھو بکل شیئ محیط — مراقبہ قدرت

(خدا ہر چیز کو احاطہ کیے ہوئے ہے)

(٦) وهو علیٰ کل شییء قدیر مراقبہ قدرت

(خدا ہر چیز پر قادر ہے)

(۷) وکفیٰ باللہ ولیاً وکفیٰ باللہ نصیراً مراقبہ رفاقت وحمایت

(اور اللہ تعالیٰ کافی رفیق ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کافی حامی ہے)

(۸) وربك الغنی ذوالرحمة مراقبہ غنا

(اور آپ کا رب بالکل غنی ہے۔ رحمت والا ہے)

بعض عوام بلکہ خواص تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اللہ تعالیٰ محض غنی ہیں اور شاید بندوں کی مصلحت کی پروانہیں فرماتے۔ یہاں پر ذوالرحمۃ کی موجودگی سے اس غلط فہمی کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

(۹) وسع ربنا کل شییء علماًط مراقبہ علمیت

(میرا پروردگار ہر شیز کو اپنے علم میں گھیرے ہوئے ہے)

(۱۰) وکفیٰ باللہ علیماًo مراقبہ علمیت

(اور اللہ تعالیٰ کافی جاننے والا ہے)

(۱۱) وکفیٰ باللہ وکیلاًo مراقبہ توکل

(اور اللہ تعالیٰ کافی کارساز ہے)

(۱۲) کل من علیها فان ویبقیٰ وجه ربك ذوالجلٰل والاکرامo

مراقبہ فنا

(دنیا میں جو کوئی ہے وہ ضرور فنا ہوگا۔ اور بزرگی اور بڑائی والا خدا باقی رہے گا)

مراقبہ فنا میں فنا کے بھی پانچ درجے ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ ذکر جسمی کے غلبہ کی وجہ سے نفس لوامہ کے برے اخلاق ان اوصاف حمیدہ میں فنا ہو جاتے ہیں جن کا شرع نے حکم دیا ہے دوسرے درجہ میں ذکر فکری کے غلبہ سے نفس لوامہ کی تمام امکانی خواہشیں احکام شرع کی پابندی میں فنا ہو جاتی ہیں۔ تیسرا درجہ ذکر قلبی کا غلبہ ہے جس کی وجہ سے تمام موجودات کے اوصاف اور افعال اللہ یعنی موجود مطلق کے اوصاف اور افعال میں فنا ہو کر نفس مطمئنہ کو جنم دیتے ہیں۔ اس کے بعد

مشاہدہ، معائنہ اور فناء الغنا کے درجات ہیں جن کے بارے میں مجھے زیادہ سمجھ نہیں۔

ان مراقبوں میں مراقبہ موت کا رنگ سب سے الگ ہے۔ اس مراقبہ کی اصل یہ آیت ہے:

کل نفس ذائقة الموت (ہر جان کو موت کا مزا چکھنا ہے)۔ اس مراقبہ میں پوری دھن، دھیان اور لگن کے ساتھ اپنے سارے وجود کو مکمل طور پر موت کی آغوش میں اس طرح تصور کرنا ہے جو کیفیت کہ اصلی موت کے وقت وقوع پذیر ہوگی۔ شروع شروع میں مجھے اس تصور سے بے حد وحشت ہوتی تھی اور موت کے خوف سے میرے روئیں روئیں پر کپکپی طاری ہو کر ڈر کے مارے گھگھی بندھ جاتی تھی۔ لیکن میرے رہنما کی مشفقانہ ڈانٹ ڈپٹ نے مجھے مسلسل اس مراقبے میں جوتے رکھا۔ پہلے تھوڑا سا خوف و ہراس کم ہوا۔ پھر کسی قدر سکون میں ثبات آیا۔ رفتہ رفتہ موت کے ساتھ محبت تو پیدا نہ ہوسکی، البتہ اس کا خوف بڑی حد تک جاتا رہا۔ کبھی کبھار واردات عجیبہ اور کیفیات غریبہ بھی محسوس ہو جاتی تھیں۔ یہ طرفہ تماشا ہے کہ موت کے خوف کی جگہ اگر اس کے ساتھ کسی قدر لگاؤ اور تعلق پیدا ہو جائے تو زندہ رہنے کا عمل بڑا سبک اور سہل ہو جاتا ہے۔

ایک رات میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا مراقبہ موت کی مشق کر رہا تھا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میرا جسم فوم کے گدے اور چارپائی کی ٹھوس لکڑی سے گزر کر نیچے فرش کے ساتھ جا لگا ہے۔ میں نے گھبرا کر اٹھ کر دیکھا تو چارپائی پر میرا اپنا وجود بھی بدستور لیٹا پڑا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ چارپائی کے اوپر جسم عنصری تھا اور پلنگ کی تہہ سے گزر کر نیچے جانیوالا جسم مثالی یعنی (Astral Body) تھا۔ یہ بھی خطرے کی گھنٹی تھی کیونکہ اگر انسان اسی مشق میں ضرورت سے زیادہ مہارت حاصل کرے تو طرح طرح کی شعبدہ بازی اختیار کر کے دنیاداری کی دکان کھول سکتا ہے۔ چنانچہ مجھے دھکا دے کر یہاں سے بھی نکال دیا گیا۔

موت کا خوف اگر اعصاب پر طاری رہے تو انسانی کردار میں بے حد کمزوری آ جاتی ہے مثلاً ہندوستان میں شاہی زمانہ کے آخری دور میں لال قلعہ دہلی کے ایک دروازہ کا نام خضری دروازہ رکھا گیا تھا جس سے جنازہ گزرتا تھا گویا موت کے نام سے بھی وحشت تھی۔ اسی طرح بعض

شہزادوں نے قرآن حکیم کی جلدوں سے سورۃ یٰسین نکال کر مسجدوں میں رکھوادی تھی کیونکہ سورۃ یٰسین کی تلاوت کا تعلق زندگی کے آخری لمحات کے ساتھ عام ہے۔ مراقبہ موت کی مشق اس قسم کے مضحکہ خیز خوف و ہراس سے ضرور نجات دلا دیتی ہے۔

ان کے علاوہ توحید افعالی، توحید صفاتی اور توحید ذاتی کے مراقبات بھی ہیں۔ جن کی تفصیل پیچیدہ ہے اور میری سمجھ سے باہر ہے۔ مراقبوں کا دور بھی بڑا دلفریب اور پر کشش ہوتا ہے، اس میں بیمار کی شفا ارواح اور ملائکہ کے کشف، کشف القبور، حاجت براری، ماضی، حال اور کسی قدر مستقبل کے حالات سے باخبری وغیرہ کے ایسے ایسے تصرفات اور تجربات سے شناسائی ہوتی ہے کہ بہت سے بدقسمت لوگ یہیں پر اپنا ڈیرہ بسا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مجھے حکم دیا گیا کہ تم ان عجائبات پر صرف ایک سرسری سی نظر ڈال کر اپنی آنکھوں پر پٹی باندھو اور جلد از جلد اس خطرناک گھاٹی سے گزر جاؤ۔

خدا خدا کر کے یہاں سے گزرا، تو آگے لطائف ستہ کی منزل آ گئی۔ انسان کے جسم میں انوار اور برکتوں والی چھ جگہیں ہیں۔ جنہیں لطائف کہا جاتا ہے۔ اول لطیفہ قلبی، دوسرے لطیفہ روحی، تیسرے لطیفہ نفس، چوتھے لطیفہ سری، پانچویں لطیفہ خفی، چھٹے لطیفہ اخفی۔ (جاری)

☆ گکھڑ کے بھائی آصف اور توقیر کے حقیقی چچا
☆ نوکھر کے بھائی ظہور بیگ صاحب کا جواں سال بیٹا
☆ نوکھر کے بھائی قیصر شاہ بخاری کی والدہ محترمہ
☆ کراچی کے بھائی علی محمد صاحب کے حقیقی بھائی

رضائے الٰہی سے وفات پا چکے ہیں تمام بھائی ان کے لئے دعائے مغفرت فرمائیں۔

ضروری اعلان

کاغذ اور پرنٹنگ کے اخراجات میں اضافے کی وجہ سے سالانہ چندہ 200 روپے کر دیا گیا ہے۔ تمام بھائی آئندہ چندہ نئی شرح کے مطابق ارسال کریں۔

زندگی اور موت کا سوال

- جب ہمارا دین مکمل، ہمارا نبی ﷺ برحق اور ہمارا قرآن اللہ تعالیٰ کی سچی کتاب ہے تو پھر ملت اسلامیہ کے زوال کی وجہ کیا ہے؟
- جب اللہ تعالیٰ نے ہم سے وعدہ فرمایا کہ اگر تم مومن ہو تو تمہیں غالب رہو گے اور یہ بھی کہا کہ اگر اللہ تمہارا مددگار ہے تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔ تو پھر ہم اسقدر مغلوب بے بس اور رسوا کیوں ہیں؟
- مسلمان نماز بھی پڑھتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں اور حج بھی پہلے سے زیادہ کرتے ہیں۔ بزرگوں کے مزاروں پر عرس بھی خوب شاندار طریقے سے مناتے ہیں۔ ماہ محرم میں بھی کیا جوش و خروش ہوتا ہے۔ مالدار بھی بہت ہیں اور لاکھوں لوگ کوٹھیوں، کاروں اور کارخانوں کے مالک ہیں تو پھر یہ محرومی کیوں ہے اور یہ تنزل کیوں ہو رہا ہے؟
- ہر طاقتور ملک کی نظریں ہمارے ملکوں پر کیوں لگی ہیں اور ہر طرف خون مسلم اسقدر بے دردی اور ارزانی کے ساتھ کیوں بہایا جا رہا ہے؟
- نکبت و ادبار کی موجودہ حالت سے نکلنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں اور کونسے لائحہ عمل پر چل کر ہم اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں

دنیائے اسلام کیلئے وقت کے اس اہم ترین سوال کا تفصیلی جواب معلوم کرنے کیلئے

بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ **حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ**

کی مندرجہ ذیل تصانیف ضرور پڑھیں

تعمیر ملت (اردو/انگلش)	چراغ راہ	حقیقت وحدت الوجود
260 صفحات قیمت/100 روپے	240 صفحات قیمت/100 روپے	پاکٹ سائز قیمت/25 روپے

ملنے کا پتہ

- ادارہ اسلامیات 190 انارکلی لاہور
- مدینہ کتاب گھر اردو بازار گوجرانوالہ
- دیوا اکیڈمی پلاٹ نمبر S.T.9 بلاک نمبر 3 گلشن اقبال کراچی
  [illegible]
- مرکز تعمیر ملت سلسلہ عالیہ توحیدیہ پوسٹ بکس نمبر 500 گوجرانوالہ

بانی سلسلہ کی دیگر تصانیف

تعمیر ملت

قرون اولیٰ میں مسلمانوں کی بے مثال ترقی اور موجودہ دور میں زوال وانحطاط کی وجوہات
اسلامی تصوف کیا ہے؟ سلوک طے کرنے کا عملی طریقہ، سلوک کا ماحصل اور سلوک کے ادوار
ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ عالم روحانی کی تشریح، جنت، دوزخ کا محل وقوع
اور ان کے طبقات کی تعداد، انسانی روح کی حقیقت کیا ہے؟ روح کا دنیا میں آنا اور
واپسی کا سفر، اسلامی عبادات، معاملات، اور اخلاق وآداب کے اسرار ورموز اور نفسیاتی
اثرات، امت مسلمہ کے لئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حصول کیلئے واضح لائحہ عمل۔

چراغ راہ

کتاب ہذا بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطبات پر مشتمل ہے۔ جو آپ نے سالانہ
اجتماعات پر ارشاد فرمائے انمیں درج ذیل خصوصی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔
سلوک وتصوف میں ذاتی تجربات، مرشد کی تلاش کے دس سالہ دور کا حال۔
زوال امت میں امراء، علماء، صوفیا کا کردار۔ علماء اور صوفیاء کے طریق اصلاح کا فرق۔
تصوف خفتہ اور بیدار کے اثرات اور تصوف کے انسانی زندگی پر اثرات۔
سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیری کی راہ کیونکر آسان ہوئی۔

طریقت توحیدیہ

یہ کتاب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا آئین ہے۔ اس میں سلسلے کی تنظیم اور عملی سلوک کے طریقے
تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جو لوگ سلسلہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں انہیں یہ
کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تصوف کی تاریخ میں پہلی
مرتبہ فقیری کا مکمل نصاب اس چھوٹی سی کتاب میں قلم بند کر دیا ہے۔ اس میں وہ تمام
اوراد و اذکار اور اعمال واشغال تفصیل کے ساتھ تحریر کر دیئے ہیں جس پر عمل کر کے
کے ایک سالک اللہ تعالیٰ کی محبت، حضوری، لقاء، اور معرفت حاصل کر سکتا ہے۔

حقیقت وحدت الوجود

کتاب ہذا وحدت الوجود کے موضوع پر ایک مختصر مگر نہایت مدلل اور اہم دستاویز ہے
خواجہؒ صاحب نے ذاتی مشاہدہ کو عام فہم دلائل کی روشنی میں آسان زبان میں بیان کیا
ابن عربیؒ کے نظریہ وحدت الوجود اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے وحدت شہود میں فرق۔
انسان کی بقا اور ترقی کیلئے مذہب کیوں ناگزیر ہے۔
وہ بنیادی سوال جس نے نظریہ وحدت الوجود کو جنم دیا۔
روحانی سلوک کے دوران تمام بزرگان عظام کو ہو جانے والی غلط فہمیاں۔